د
١٨

خاکہ ہندوستان

از

محمد عبد الرؤف

خاکہ نصیر وشان

فہرست مضامین

سلسلہ نشان	عنوان	صفحہ
(۱)	پیش لفظ	(الف)
(۲)	قدیم یونانی تصور ریاست	(۱)
(۳)	یورپ میں قومیت کا ارتقاء	(۱۴)
(۴)	خصوصیات قانون دستور انگلستان	(۲۰)
(۵)	ہندوستانی سیاسی مدوجزر	(۳۴)
(۶)	ہندوستانی کانگریس کا اصول اور عمل	(۴۷)
(۷)	ہندوستانی دستوری ارتقاء	(۶۴)
(۸)	ماہیت وفاق	(۷۸)
(۹)	جدید دستور ہند	(۸۴)
(۱۰)	کانگریس اور وفاق	(۱۰۹)

(۱۱) اچھوت اقوام اور آزادی ۱۲۳

(۱۲) مسلمانوں کی سیاسی بیداری ۱۳۱

(۱۳) اکثریت بمقابلہ اقلیت ۱۴۲

پیش لفظ

زمانہ کروٹیں نہایت سرعت سے بدل رہا ہے۔ کوئی ملک اپنی جگہ مطمئن نظر نہیں آتا۔ بالخصوص ہندوستان جو مختلف مذاہب و اقوام کا گہوارہ ہے سخت سیاسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ سائنس کی ترقی نے تمام ممالک کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا ہے۔ اور ایک ملک کے غیر معمولی حالات و تحریکات دوسرے ملک پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی لئے ہندوستانی سیاسیات کا مطالعہ بین الاقوامی حالات کی روشنی میں کرنا ضروری ہے۔

اس وقت عظیم تر ہندوستان کا خاکہ پیش ہے اور اسکے تخیل سے اصولاً تمام متفق ہیں لیکن اسکے مالہ و ما علیہ، اس کے تاریخی پس منظر، اور ہر قوم و جماعت کی اہمیت و ذہنیت نیز اسمیں ہر ایک قوم کا حصہ غرض ان تمام امور کا بنظر غائر مطالعہ ضروری ہے۔ بغیر اس کے ہندوستانی حالات حاضرہ کے مطالعہ میں نہ تو دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ صحیح نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ ان ہی چند خیالات کے پیش نظر میں نے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا۔ اس سے منشا یہ ہے کہ پبلک ان امور سے حتی الوسع واقف ہو اور اس میں صحیح سیاسی شعور پیدا ہو اسلئے کہ ملک کی ترقی عوام کی بیداری پر منحصر ہے۔

اب ان ہی مضامین کو جو اخبار میں شائع کئے گئے تھے، کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

میں جناب مولوی احمد محی الدین صاحب ایڈیٹر رہبر دکن کا مشکور ہونگہ صاحب موصوف نے ان مضامین کو بلا تاخیر اپنے موقر اخبار میں شائع فرماکر میرے ساتھ نہ صرف تعاون فرمایا بلکہ پبلک کی اہم خدمت انجام دی۔ اسی سلسلہ میں میں اپنے محترم دوست و ہم جماعت مولوی محمد ذکا اللہ صاحب بی' اے' ال ال' بی وکیل ہائیکورٹ و مولوی محمد غوث محی الدین صاحب ایم' اے' ال ال' بی (آخری) کا بیحد ممنون ہونگہ صاحبان موصوف نے مضامین کے پروف دیکھنے میں اپنا قیمتی وقت صرف فرمایا اور ان ہی حضرات کی سعی و حسنِ توجہ سے مضامین زیور طباعت سے آراستہ ہوئے فقط

رائچور (دکن)
۱۰ر بہمن ۱۳۴۹ ف

محمد عبدالرؤف

قدیم یونانی تصوریاست

سرزمین یونان سے علوم کے ایسے سرمدی سوت جاری ہوئے ہیں کہ ان سے دنیا ہمیشہ مستفید ہوتی رہے گی۔ بنی نوع انسان پر عقلاءِ یونان کا اس قدر احسان عظیم ہے کہ ان سے دنیا کبھی سبکدوش نہ ہو سکے گی۔ باوجود صدیاں گزر جانے کے ان کے تخیلات و تصورات، مختلف علوم و فنون میں اب بھی ممد ہیں حتیٰ کہ اُن کی غلطیاں دوسروں کی صحت فکر سے بدرجہا فکر و عمل کی طرف راغب کرتی ہیں۔ غرض کہ یہاں خدا کی خاص رحمت معلوم ہوتی ہے کہ آسمان علوم پر ایسے درخشاں انجم نمودار ہوئے جن کی روشنی ہمیشہ قایم رہیگی۔

ہمارا موضوع یونانی فلسفہ یا حسن کاری نہیں بلکہ سیاسیات ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس پر غور کیا جائیگا کہ مملکت کے متعلق یونانی تصور کیا تھا اور اس مملکت میں اشخاص کا کیا درجہ تھا نیز یہ کہ افلاطون اور ارسطو کے نظریات سیاسیات کس حد تک قابل عمل و مطابق فطرت انسانی تھے۔

سب سے پہلے یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ۵ ویں صدی ق۔م میں یونانیوں کا معاشرہ اتنا پیچیدہ نہ تھا جتنا کہ موجودہ زمانہ میں ہے

ان کے نزدیک سوسائٹی میکانیکی نہ تھی بلکہ ایک مقدس گروہ۔ تیسرے یہ کہ سماج میں شہری، غیر شہری آزاد اور غلام کا امتیاز قایم تھا۔ ان خصوصیات معاشری کو ملحوظ رکھنے سے یونانی تصور ریاست کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یونان کے لئے ہر شہر ایک ریاست تھا۔ یہ تصور اتفاقی نہ تھا بلکہ اس تصور میں ہی اس کی تحدید مضمر تھی اگر خاص تعداد سے آبادی زائد ہوتی یا رقبہ بڑھ جاتا تو ان کے نزدیک وہ ریاست ہی نہ تھی گویا تصور یہ تھا کہ "ایک شہر کے لئے دس آدمی کم اور ایک لاکھ زائد ہیں۔

اس شہری مملکت میں شہریوں کا مقام یہ تھا کہ ہر شہری محض ٹیکس ادا کرنے یا حق رائے دہی رکھنے والا نہ تھا بلکہ ریاست کے کل معاملات میں اس کو براہ راست حصہ لینے کا حق حاصل تھا۔ وہ سپاہی، جج، رکن اسمبلی و جماعت عاملانہ سب کچھ تھا اور ان امور نظم ونسق کو وہ خود انجام دیتا گویا یونان میں "نیابتی حکومت" کا تصور نہ تھا اور ان کے خیال میں حکومت "امانت" نہ تھی جو رعایا کی جانب سے منتخب جماعت کے سپرد کی جاتی ہے جیسا کہ آجکل ہم مختلف ممالک میں دیکھتے ہیں۔ بلکہ "براہ راست خدمات کی انجام دہی" اس تصور کا خاص عنصر تھا۔

اس تصور کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ "جماعت کے لئے انفرادی ایثار سے کام لے۔ اس سے یہ منشا نہیں کہ انفرادی اور ریاستی اغراض میں تعرض ہو تو ایثار سے کام لے بلکہ بہترین شخص وہی ہے جو بہترین شہری ہے۔

یہ دونوں ناقابل امتیاز تھے۔ انفرادی جدوجہد، میلان، انتخاب پیشہ وغیرہ سختی سے خارج تھے۔ تولید، رہائش، تعلیم وغیرہ تمام امور ریاست کے اختیار میں تھے۔ شخص منفرد کے حصول مقصد کا ذریعہ سوسائٹی تھی اور ریاست اس کا مقصد۔ انسان اپنے لئے نہیں بلکہ ریاست کے لئے ہے اور ریاست بقول ارسطو "ہم خیال اشخاص کی جماعت ہے جو اعلیٰ زندگی کے حصول کے لئے مرتب ہوئی ہو"۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست کے اصول انفرادی آزادی پر کوئی روک یا تحدید عائد کرنے والے نہ تھے بلکہ جزکل میں شریک رہے"۔

یونانی سیاسی نظریہ میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان میں احترام قانون عادتاً زیادہ تھا مقننین کے متعلق ان کا خیال تھا کہ قوت الٰہی ان کی رہبری کرتی ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ کسی ریاست کی فلاح کے لئے اس کے شہروں میں اس خیال کا ہونا لازمی ہے۔ مشہور خطیب ڈیماستھینز نے اس خیال کا اظہار کہ ہر شخص قانون کی پابندی کرے جیوری سے مخاطب ہو کر اس طرح کیا ہے "اے اتھنز کے باشندو! انسان کی ساری زندگی وہ بڑے شہر میں مقیم ہو یا ایک دیہات میں، قدرت اور قوانین قدرت کے تابع ہے۔ ان میں قدرت، غیر منظم، غیر مساوی اور انفرادی قابض کے لئے مخصوص ہے اور قوانین منظم عام اور تمام کے لئے یکساں ہیں۔ قوانین وہی چاہتے ہیں جو مناسب باعزت

اور مفید ہو۔۔ یہ حاصل ہونے پر وہ تمام کے لئے "حکم" کے طور پر جاری ہوتے ہیں۔ یہی قانون ہے جس کی تعمیل کئی وجوہ سے لازمی ہے بالخصوص اس لئے کہ ہر قانون دیوتاؤں کی ایجاد اور عطا ہے۔ عقلاء کا مقصد ارادی اور غیر ارادی غلطیوں کی اصلاح ہے۔ یہ ایک عہد ہے کل ریاست کا جس کے مطابق ہر شخص کو جس کا تعلق ریاست سے ہے زندگی بسر کرنا ہے"۔ قانون اور انصاف کا تطابق کلی ریاست میں نہیں ہوا ہے۔ یونانیوں نے اس کی کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ تطابق ہو ان کا خیال تھا کہ جو قانون کے مطابق ہے وہ واجبی ہے" باوجود جمہوریت کے یونانی تصور میں یہ بھی تھا کہ باشندگان میں "امتیاز" قایم کیا جائے چنانچہ شہری، غیر شہری، آزاد وغلام جیسی تقسیم اور اس پر عمل تھا۔ غیر شہری باشندے بھی دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو کاریگر اور مزدور تھے جنھیں سیاسی حقوق حاصل نہ تھے شہریوں کا مرتبہ اعلیٰ اور وہ امراء سمجھے جاتے تھے۔ پبلک لائف میں ان کی اہمیت زیادہ تھی اور انھیں ملکی فرائض کی انجام دہی میں کافی وقت و توانائی صرف کرنا پڑتا تھا غیر شہری جماعت ادنیٰ تصور کی جاتی اور وہ شہریوں کے فرائض کی انجام دہی میں سہولت بہم پہنچاتی تھی۔ اسپارٹا اور اتھنہ میں یہ تصور تھا۔ اتھنز میں عمومیہ قایم تھی اور وہاں اس جماعت کو سیاسی حقوق حاصل رہنے کے باوصف وہ معاشری کمتری کی شکار ضرور تھی۔ تاہم عام طور پر برتاؤ اچھا تھا عام یونانی کے لئے یہ خیال کوئی تعجب انگیز نہ تھا لیکن مقام حیرت ہے کہ

افلاطون اور ارسطو جیسے بلند پایہ مفکرین بھی اس زمانہ کے عام خیال اور عمل سے آزاد رہکر اس خصوص میں غور و فکر نہ کر سکے اور انھوں نے اپنی تصوری ریاست میں اس جماعت کو سیاسی اختیارات نہیں دیئے ..... ارسطو نہایت اطمینان سے غلامی کی نسبت سوال کرتا ہے کہ "کیا وہ فطری ہے" اور خود ہی اسکا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ "غلام ایک ذی حیات ذریعہ ہے اور ذریعہ ایک بے جان غلام" گویا مفروضات سے کام لیکر اس امتیاز کو قایم رکھا اور غلامی کو فطری سمجھا۔ تاہم یونان میں ہی بعض ایسے شعراء اور مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے اس مفروضہ کی تردید کی کہ بعض فطرۃً غلام ہوتے ہیں۔ "صرف قسمت نے انھیں اس درجہ پر رکھا ہے۔"

یونانی ریاستوں میں غلاموں کی تعداد زیادہ تھی۔ ۴ صدی ق۔م کے اختتام پر ایتھنز میں چار لاکھ غلام اور ایک لاکھ شہری تھے۔ اکثریت کا ہر قسم کے پیدا آور ذرائع میں حصہ تھا اس طرح ایک بڑی جماعت یونان میں معاشری اور سیاسی حقوق سے محروم تھی۔ یونانیوں کے خیال میں بعض حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور بعض خدمت کے لئے۔ بعض مقصود بالذات ہیں بعض ذریعہ۔ اس امتیاز اور تفوق کی اصلی وجہ یہ تھی کہ سپارٹا اور کریٹ کے باشندے فاتح تھے۔ فاتح اور مفتوح کا تصور باقی تھا جس کی وجہ فاتح خود کو برتر سمجھتے تھے۔ شہری مالک اراضی ہوتا اور ادنےٰ درجہ کے لوگ اس کی کاشت کرتے۔ جسمانی، ذہنی اور

اخلاقی ترقی سے تاجر اور دیگر پیشہ ور اعلیٰ اجماعت میں شریک کر لئے جاتے تھے۔ باوجود اس تصور میں تبدیلی کے یہ امتیاز باقی تھا۔

سماجی امتیاز نے سیاسی تخالف کی صورت اختیار کی۔ ہر ریاست میں یہی دو عناصر (سماجی و سیاسی) کارفرما تھے جس کی وجہ آئے دن خانہ جنگی ہوتی رہی۔ اس زمانہ میں نزاج کی انتہائی صورت موجود تھی۔ ۵ ویں صدی ق۔م کے اختتام پر مشہور جنگ "پیلوپانی سَن" ہوئی جس کی وجہ یونان دو حصوں میں منقسم ہوا۔ (۱) اتھنز (۲) سپارٹا۔ (۱) میں عمومیہ قایم رہی (۲) میں معدودیہ ( ) ان دونوں ریاستوں کے مقاصد مختلف تھے جس کی وجہ یونان کی قومیت منقسم ہوئی۔ سپارٹا میں شہری اور غیر شہری کی تفریق شدید تھی۔ ایک حاکم تو دوسرا محکوم۔ اس ریاست میں فوجی تربیت اور تنظیم پر زور دیا جاتا تھا۔ اس ریاست کے تحفظ کے لئے مشہور مقنن لسرگس نے قوانین سازی کی۔ اس کی کوشش تھی کہ خانگی جائداد کو محدود اور مساوی کیا جائے۔ اس کی اجتماعی زندگی مثل ایک کیامپ کے تھی۔ مختصر یہ کہ (۱) تولید و پرورش اولاد پر ریاست کا اختیار تھا۔ (۲) عورتوں کی خاص تربیت جسمانی کی جاتی اور خاص عمر میں شادی ہوتی تھی۔ آزاد اختلاط کی اجازت تھی۔ غیر شادی شدہ اشخاص کے لئے خاص مواقع تھے۔ (۳) اولاد صحت مند اور مضبوط ہوتی تو رکھی جاتی ورنہ ہلاک کر دیجاتی تھی۔ (۴) سات سال کی عمر تک بچوں کی پرورش والدین کرتے اس کے بعد ریاست انھیں اپنی نگرانی میں لیتی،

غذا، لباس، مکان، معمولی ہوتا۔ خانگی زندگی باقی نہ تھی۔ تمام کے لئے ایک ہی مشترک طعام خانہ تھا۔ سکہ لوہے کا تھا تاکہ کوئی جمع یا پوشیدہ رکھنے کا خیال نہ کرے۔ زراعت کی طرف بھی توجہ تھی۔ ذہنی سے زیادہ اخلاقی تربیت کو اہمیت دیجاتی۔ اس ریاست کے اصول افلاطون کی "جمہوریت" سے ملتے جلتے ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ سپارٹا میں فوجی تربیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ سپارٹا کا دستور غیر تبدیل پذیر تھا۔ لسرگس کی کوشش تھی کہ خانگی جائداد کے تصور کو نکال دیا جائے لیکن اس سے بیشتر ہی لوگوں کے پاس دولت جمع تھی جن کی تعداد قلیل تھی۔ انہیں ذریعہ وراثت یا ہبہ اراضیات بھی حاصل ہوئیں اس کے بعد جب سپارٹا کو اتھنز پر فتح حاصل ہوئی تو وہ لسرگس کے خشک اصول پر عمل کرنے سے گریز کرنے لگے۔ فوجی افسر اور مدبرین جنہوں نے مال غنیمت اور حکومت حاصل ہونے کے بعد مشرقی ممالک میں بادشاہ کی طرح حکومت کی تھی ان کے لئے لسرگس کے خشک اصول قابل قبول نہ تھے انہوں نے آزادی سے عیش و آرام کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ گویا اتھنز کی فتح ہی ان کے زوال کا باعث ہوئی اور انہوں نے عروج و زوال کے دونوں سبق آموز پہلو دیکھے ...... بخلاف اس کے اتھنز میں عمومیہ کی انتہائی صورت تھی۔ یہاں کا دستور تبدیل پذیر تھا۔ مساوات انتہائی درجہ پر تھی باشندگان میں کوئی امتیاز سیاسی یا سماجی نہ تھا وہاں غلام بھی تھے لیکن سیاسی حیثیت سے انھیں بھی ہر قسم کے اختیارات شہریوں کے سے

حاصل تھے۔ قابلیت کے فرق و امتیاز کو بھی انہوں نے مٹا دیا تھا۔ ہر شخص حکومتی معاملات میں براہ راست حصہ لے سکتا تھا بالآخر ایک دور ایسا آیا جبکہ متوسط اور ادنیٰ طبقہ نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا۔ اتھنز میں سیاسی مساوات معاشی عدم مساوات پر قایم کی گئی۔ سیاسی حیثیت سے اتھنز کا ہر کاریگر وغیرہ تمام یکساں تھے۔ اس حد تک اتھنز میں خاص جمہوریہ تھی۔ لیکن یہاں بھی غلاموں کی اکثریت تھی۔ آزاد شخص کے لئے یہ حکومت عمومیہ تھی غلام کے لئے معدودیہ تھی اس لئے طبعاً غلاموں کو سیاسی حقوق حاصل نہ تھے بلکہ وہ مختلف خدمات انجام دیکر قابلیت پیدا کر سکتے تھے۔ ان کے ظاہری لباس میں کوئی فرق نہ تھا۔ آقا کے بیجا ظلم سے وہ محفوظ تھے۔ عام طور پر یونان میں غلاموں کے ساتھ برتاؤ اچھا ہی رہا۔ اگرچہ سختی ممکن تھی اس لئے کہ مالک کا اختیار غلام پر کافی تھا۔ ارسطو کا خیال تھا کہ "غلام اور آقا میں ایک خاص مفاد اور مہربانی ہوتی ہے" افلاطون کا بھی یہی خیال تھا اتھنز میں غلاموں کو کامل آزادی تقریر حاصل تھی وہ جائداد کے مالک بنکر آرام سے زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اگرچہ غلامی ایک جمہوری ادارہ ہے لیکن اتھنز میں اس کو جمہوریت کے روپ میں پیش کیا گیا جس کی وجہ یہاں کی آزادی اور انفرادی موقف کی برتری، اور ریاستوں میں موجود نہ تھی۔ لیکن پیری کلس کی وفات کے ساتھ اس کا عظیم الشان دور ختم ہوا۔ داخلی وجہ سے اس میں کمزوری پیدا ہوئی۔ خزانہ عامرہ سے لوگوں کو امداد دیجاتی تھی۔

شرکت اسمبلی پر فیس دیجاتی۔ جو رقم کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ جس کے باعث ان میں آرام طلبی بڑھتی گئی اور اخلاق کمزور ہوتا چلا۔ غریب اور معمولی اشخاص بھی شریک ہونے لگے۔ ان کی کوشش یہ رہتی تھی کہ مقدمات میں اضافہ ہوتا کہ معاوضہ ملے گویا ایک طبقہ ایسا تھا جو چاہتا تھا کہ اس قسم کی حالت اور مواقع پیدا کئے جائیں۔ جن کے متعلق ڈیماستھنز کہتا ہے کہ وہ بچھو کی طرح ڈنک نکالے عام مقامات پر گشت کرتے تھے۔ غرضکہ سپارٹا اور اتھنز دونوں ریاستوں نے تفریط سے کام لیا اور یہی ان کے زوال کا باعث ہوئی۔

افلاطون اور ارسطو کے نظریہ پیش کرنے سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ یونانیوں میں سوسائٹی کا یہ تصور نہ تھا کہ وہ پیدائش و تقسیم دولت کی مشین ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی معاشرت سادہ تھی اور یہ کہ مزدور پیشہ جماعت کو دوسروں کی پرورش کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ غریب اور امیر کے امتیاز اور ردِ عمل کی تہہ میں معاشی اثر اتنا ہی تھا جتنا سیاسی۔ سیاسی انقلابات معاشی وجوہ کی بناء پر ہوتے رہتے ہیں۔ معاشری مسئلہ کی اہمیت پیدا ہوئی۔ سیاسی مفکرین اس خیال میں منہمک رہنے لگے کہ معاشی عدم مساوات کا ازالہ کس طرح کیا جائے۔ مثلاً سولن نے انہی قرضہ جات ممنوع قرار دیئے جو ذاتی ذمہ داری یا کفالت پر حاصل کئے جاتے ہیں۔ لسرگس نے سپارٹا میں کُل اراضی بحق سرکار حاصل کر کے رعایا میں علی السویہ تقسیم کی تھی" تاہم کوئی ایسا کامیاب مستقل طریقہ

اختیار نہیں کیا گیا جس سے سوسائٹی میں توازن قایم ہوتا۔

جمہوریت افلاطون کی ایک لاثانی تصنیف ہے اس میں اپنے خیالات متعلق مذہب، سیاسیات و حسن کاری کو جوڑنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ افلاطون اپنے زمانہ کی ریاکاری، کذب، اخلاقی کمزوری کو دیکھ کر نا امید ہوتا ہے اور بجائے نکتہ چینی کرنے یا سوسائٹی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے ایک تعمیری نقشہ قوم کے لئے "جمہوریت" میں پیش کرتا ہے تاکہ ملک اس پر عمل پیرا ہو۔ اس کا مقصد تھا کہ "سپارٹا کی فولادی تنظیم اور ایتھنز کی متنوع ثقافت کو ملایا جائے۔ سیاسیات اور اخلاقیات کا امتزاج کیا ہے۔ انسانی نیکیوں کو ریاست سے جوڑتا ہے۔

یونانیوں میں آپس میں جنگ غیر فطری ہے۔ بادشاہ فلسفی ہو یا فلسفہ سے اس کو مس ہو۔ اگر کوئی فلسفی خراب ہو تو یہ الزام شخصی ہوگا لیکن فلسفہ معائب سے پاک ہے اور فلسفی کامل انسان اور بالغ نظر ہوتا ہے ہر ریاست میں تین مدارج ہوتے ہیں (۱) حکمران (۲) سپاہی (۳) کاریگر انہیں خاص صفات کا ہونا ضروری ہے (۱) کے لئے عقل (۲) کے لئے جرأت، اس میں اطاعت ضروری ہے اور ریاست کے لئے انصاف لازمی ہے۔ انفرادی مفاد کو کل کے تابع کرنا چاہیئے۔ خانگی جائداد کا وہ شدید مخالف تھا۔ خانگی زندگی، تعلیم، پرورش انتخاب پیشہ وغیرہ تمام ریاست کے اختیار میں ہو۔ گویا ریاست مثل ایک خاندان کے ہو۔ سپاہی اپنی خدمات کے عوض ضروریات کی تکمیل کرلیں اُن کی

اجرت یا تنخواہ اتنی ہو کہ اس کی وجہ موازنہ میں کمی یا زیادتی نہ ہو، اگر یہ لوگ جائداد کے مالک ہو جائیں تو وہ بجائے محافظت کے مزارعین و مالکان جائداد ہوں گے اس طرح وہ اپنے ہی برادران کے دشمن ہونگے۔ افلاطون نے زراعت کو اہمیت دی ہے اور تجارت کی قدر گھٹائی ہے اس کا خیال تھا کہ ہر شہری زمیندار ہو تاجر نہ ہو وہ شہریوں میں مساوی طور پر اراضی تقسیم کرتا ہے اس کی بیع و شرٰی یا تقسیم ذیلی کو روکتا ہے۔ روزمرہ استعمال کی حد تک دولت کو محدود کرتا ہے سود پر رقم چلانے سے منع کرتا ہے اس طرح وہ عدم مساوات دولت کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "مقنن کا مقصد شہر کو عظیم بنانا نہیں ہے بلکہ خوش حال۔ جو اچھے ہیں وہی خوش ہیں"۔ مسرت اور دولت اجتماع ضدین ہیں"۔

شاعری خاص ججوں کے زیر نگرانی رہے۔ ایسے ڈرامے جن سے انسانی اور روحانی زندگی کا غلط مظاہرہ ہوتا ہو روک دیئے جائیں۔ نوجوانوں کو جسمانی، ذہنی اور روحانی ترقی کے لئے ورزش، موسیقی، ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم ضروری ہے جسم کو اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ روح کے ماتحت رہے۔

افلاطون نے جماعتوں میں تفریق کی ہے (۱) ایسی جماعت جو پیدا آور ذرائع اختیار کرے اس کو سیاسی اختیارات حاصل نہ تھے (۲) سپاہی اور حکام اس نے دوسری جماعت سے زیادہ بحث کی ہے

اور اس کی اہمیت پر زور دیا ہے افلاطون کی تصنیف کا مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا فلسفہ معاشری یا نظریہ سیاسیات فلاح انسانی کے خیال سے اچھا ہو لیکن وہ نا قابل عمل اور فطرت انسانی کے خلاف ہے اس لئے کہ اس سے انفرادیت زائل اور آزادی محدود ہوتی ہے۔ افلاطون انسان کی قدر نہ پہچان سکا۔ اور اپنے زمانہ کے عام خیال "تصور غلامی" سے بالاتر نہ رہ سکا۔ افلاطونی تصوری ریاست کے بعد اسی قبیل کی کئی تصانیف مفکرین نے لکھی ہیں جن میں قابل ذکر مصنفین یہ ہیں۔ سسرو۔ سینٹ گسٹائن۔ سر تھامس اور لارڈ بیکن۔ یہ تمام تصانیف عملی سے زیادہ تصوری ہیں"۔ افلاطون نے "جمہوریت" کے خیالات کے متعلق اپنی دوسری تصنیف "قوانین" میں نا قابل عمل ہونا تسلیم کیا ہے۔

ارسطو نے اپنی تصنیف "سیاسیات میں اپنے نظریہ سیاسیات کو پیش کیا ہے اس کا خیال یہ ہے کہ "سیاسیات کا مقصد" شہریوں میں خاص کردار پیدا کرنا اور انھیں اعلیٰ خدمات انجام دینے کے قابل بنانا ہے" انسان ایک مدنی یا سیاسی وجود ہے اور وسیع تر کل کا جز ہے۔ ریاست منفرد اشخاص کی معیار ہے زندگی کی بنیاد خاندان پر ہے اور خاندان، مرد، عورت اور اولاد، والدین، غلام وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے خاندان سے فرقہ بنتا ہے اور فرقہ سے ریاست۔

ارسطو حکومت کے اقسام بیان کرتے ہوئے ملوکیت کو بہتر اور

استبدادیت کو مضر بتلاتا ہے۔ اگر شخص واحد کی حکومت دانشمندی پر منحصر ہو تو وہ بہتر ہے بخلاف اس کے اگر اس کا انحصار، جائداد یا بندش پر ہو تو مضر۔ حکومت کی بہتر صورت وہ ہے جس میں انفرادی اور خاندانی ضروریات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل ہوتی ہو اور جس میں بڑی سے بڑی تعداد کی اخلاقی ثقافت ہوتی ہو۔

ارسطو کا فلسفہ معاشری یہ ہے کہ وہ بھی افلاطون کی طرح "اجماع دولت کا مخالف ہے" لیکن اس اجتماع میں تفریق کرتا ہے (۱) فطری (۲) غیر فطری (۱) رفع احتیاجات کے لئے ضروری ہے اور یہ فطری ہے۔ (۲) غیر فطری یہ کہ جمع کرنے کی غرض سے حاصل کیجائے۔ مذموم طریقہ یہ ہے کہ دولت کے ذریعہ دولت حاصل کیجائے۔ اسکا خیال ہے کہ "منفرد اشخاص کی دولت مشترک مفاد کے لئے امانت ہے"۔

یونانی فلسفہ معاشری اور نظریہ سیاست کا مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد تقابلی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ معاشرہ کی پیچیدگی اور وسعت نے نئے نئے مسائل پیدا کئے اور اس کے نئے حل تلاش کئے جارہے ہیں موجودہ نظام معیشت میں مزدور۔ اور کاریگروں کی کافی اہمیت ہے۔ یونانی تصور غلامی ہمارے موجودہ تصور کے مغائر ہے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کو اپنے مقصد براری کا ذریعہ بنائے بلکہ ہر شخص مقصود بالذات ہے۔ تاہم اس زمانہ میں بھی "نسلی امتیاز" بعض جگہ باقی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعض اشخاص

فطرتاً غلام ہیں ۔مثلاً امریکنوں کا تصور حبشیوں کے متعلق ۔اصولاً حبشی اور امریکی مساوی ہیں لیکن عمل اس کے مغائر ہے حبشی کو سماجی و سیاسی حقوق حاصل نہیں ہیں اقوام کے عروج و زوال کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جس رنگ کو آج وجہ کمتری سمجھا جاتا ہے ممکن ہے وہی آئندہ باعث تفوق ہو ۔

یونانی تصور میں نقائص ضرور ہیں اس سے اتنا ضرور فائدہ ہوا کہ "شخص واحد" اجتماعی زندگی سے خود کو مطابق کرے جس سے محدود انفرادی مفاد کے بجائے وسیع نقطہ نظر اور اعلیٰ مقاصد اس کے پیش نظر رہیں گے افادیت کی بنیاد موجودہ زمانہ میں ان ہی خیالات پر ہے ۔فقط

یورپ میں قومیت کا ارتقاء

پندرہویں صدی سے قبل یورپ میں پاپائے روم اور شہنشاہیت کو نہایت اہمیت حاصل تھی ۔شہنشاہ کی موجودگی کی وجہ سے یورپ کے دیگر ممالک کے بادشاہ مطلق العنان نہ تھے ۔ ان بادشاہوں کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح شہنشاہیت کے جوئے کو اپنی گردنوں سے اتار کر خودمختار بن جائیں ۔مذہبی نقطہ نظر سے پاپائے روم کی شخصیت اہم ہوتی ہے

پوپ دار السلطنت اٹلی کے شہر روما میں رہا کرتا تھا۔ تمام عیسائی بادشاہ پوپ کی عزت کیا کرتے تھے پوپ مذہبی دائرہ سے ہٹ کر سیاسی معاملات میں بھی دخل دیا کرتا تھا اور وہ غیر جانبدار نہ رہا۔ مذہبی رہنما مذہب سے ہٹے ہوئے تھے تاہم ان کی عظمت لوگوں کے دلوں میں باقی تھی۔ ان رہنماؤں نے "حریت فکر" کی بھی شدت سے مخالفت کی فلسفیوں اور سائنس دانوں کے یہ سخت مخالف تھے۔ "برونو" فلسفی کو زندہ جلایا گیا۔ "گیالی لو" اور "کوپرنیکس" کو محض اس وجہ سے کہ ان کی انکشافات مذہبی عقائد کے مغائر ہیں مقید کیا گیا۔ غرضکہ ہر شعبہ زندگی میں ان کا کافی اثر تھا۔ بادشاہ ان کے اثر کی وجہ سے ان سے خائف تھے اور ہر وقت ان کے حکم پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دن نہ رہی۔ بالآخر دو اہم تحریکات کا آغاز ہوا۔ ایک اس زمانہ کی مذہبیت کے خلاف تھی جس کو رفارمیشن REFORMATION کہا جاتا ہے دوسری تحریک "حریت فکر" کی حامی تھی جسکو نشاط جدید RENAISSANCE رینی سانس کہا جاتا ہے۔ تحریک اولیٰ سے مذہبی رہنماؤں کا اثر زائل ہوتا رہا۔ دوسری تحریک سے آزادی فکر کا حق حاصل ہوا۔ اس تحریک سے علوم میں بے انتہا ترقی ہونے لگی۔ فلسفہ اور سائنس میں قابل قدر ترقی ہوتی رہی۔ آئے دن جدید انکشافات و ایجادات ہونے لگے جن سے بنی نوع انسان بلا تفریق قومیت مستفید ہونے لگے۔ بیکن جیسے

مفکر نے اس امر کی کوشش کی کہ سائنس سے زندگی کو سہولت بخش اور آرام دہ بنانے میں کام لیا جائے۔ منطق استقرائی کے جدید اصول ترتیب دیئے گئے جن سے انکشافات میں سہولت ہو۔ فلسفہ مذہبی اثر سے نجات پاکر مکرر آزادانہ تفکر میں منہمک رہا۔

مذہبی تحریک REFORMATION کا بانی لوتھر تھا۔ اس زمانہ کا عمل مذہب سے ہٹا ہوا تھا۔ مذہب کی جگہ توہمات نے لے لی تھی۔ مذہب کے نام پر بیجا سختیاں کیجاتیں۔ اسی لئے لوتھر نے اس زمانہ کے مذہبی عقائد کے خلاف پروپگنڈا شروع کیا جس میں اس کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ بادشاہ بھی چاہتے تھے کسی طرح پوپ کے ناجائز دباؤ اور اثرات سے نجات پاکر مطلق العنان ہوجائیں اس لئے انھوں نے بھی اس تحریک کی دل کھولکر تائید کی۔ اس سلسلہ میں ہمیں اس تحریک کا سیاسی رجحان پر جو اثر مترتب ہوا اسی پر غور کرنا ہے نہ کہ علوم پر۔

اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یورپ کے بادشاہ شہنشاہیت کے مخالف تھے۔ ان دونوں تحریکات کی وجہ سے خیالات میں تبدیلی ہونے لگی اور کچھ عرصہ ملک میں تراج کی سی حالت رہی۔ اس زمانہ کے مورخین نے جدید سیاسی نظریہ "اقتدار اعلیٰ" پیش کیا جس کی اشاعت میں بادشاہوں نے کافی حصہ لیا اس لئے کہ اس سے ان کے منشاء کی تکمیل ہوتی تھی۔ مورخین یا سیاست دانوں کی بادشاہوں نے

خوب مدد کی۔ اس زمانہ میں "اقتدار اعلیٰ" پر کافی لٹریچر پیدا ہوا۔ اس نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ "بادشاہ اپنے ملک میں مطلق العنان اور مختار مطلق ہے اور اس کی یہ قوت غیر محدود اور غیر منقسم ہے ہر ملک میں اقتدار اعلیٰ کا وجود لازمی ہے"۔ اس نظریہ کا بانی فرانسیسی سیاس "بودہان" ہے اور انگلستان میں اسکا علمبردار "ہابس"۔

۱۶۴۸ء میں "عہد نامہ ویسٹ فیلیا" کی رو سے شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا اور تمام بادشاہ اپنے اپنے ممالک میں خود مختار تسلیم کئے گئے اور وہ نہایت اطمینان سے حکومت کرنے لگے۔ بادشاہ بادشاہ میں مساوات رہی عرصہ تک یہ دور حکومت شاندار رہا۔ رعایا اپنی حالت سے خوش تھی بادشاہ بھی چونکہ انھیں کافی جد وجہد کے بعد حکومت حاصل ہوئی تھی امن سے حکومت کرتے رہے۔ ملک میں "راعی رعایا" صرف دو جماعتیں تھیں اور اس دور حکومت میں تصور "رعیت" تھا نہ کہ "شہریت" ہر ملک میں احساس و تصور قومیت پیدا ہوا۔ ابتداء زمانہ سے بادشاہ اپنی حالت پر نہ رہے اختیارات کا غلط استعمال ہونے لگا رعایا پر ظلم و زیادتی ہونے لگی۔ زمانہ تک رعایا نے صبر و سکون سے مظالم و مصائب کو برداشت کیا بالآخر پیمانہ صبر چھلکا اور وہ رد عمل کے لئے تیار ہو گئی اور بادشاہ کے خلاف انجمنیں قائم ہونی شروع ہوئیں ایسی انجمنیں اس پر غور کرنے لگیں کہ سیاسی حیثیت سے بادشاہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا رعایا کو اور ان دونوں کے

حقوق و فرائض کیا ہیں۔ ایسے خیالات بے انتہا خونریزی و ظلم و تعدی کے بعد پیدا ہوئے نہ کہ بیک وقت ۔ یہ دنیا کی ہیئت ہے کہ انسان کو اپنے نصب العین میں کامیابی بے انتہا تکالیف و قربانیوں کے بعد حاصل ہوتی ہے ۔

سب سے پہلے فرانس میں یہ خیال پیدا ہوا اور اس کو اہمیت حاصل ہوئی کہ سیاسی نقطۂ نظر سے رعایا کی اہمیت زیادہ ہے ۔ گویا فرانس والوں نے ہی اقتدار اعلیٰ کی سب سے زیادہ تائید کی تھی اور انھوں نے ہی اس کے خلاف سب سے پہلے پروپگنڈا شروع کیا ۔ موجودہ جمہوریت کا سہرا فرانس ہی کے سر ہے ۔ فرانس میں انقلاب عظیم ہوا جس کے بعد وہاں جمہوریت قایم ہوئی ۔ اس عام تحریک کے استحکام کا نتیجہ یہ ہوا کہ ممالک میں خود مختار حکومت کمزور ہو چلی اور جمہوریت کا قیام ہونے لگا ۔ تصور "رعیت" "شہریت" سے بدل گیا ۔ اس عبوری دور میں جمہوریت کا دَور دورہ رہا ۔ ملک میں پارٹیاں قایم ہونی شروع ہوئیں جو پارٹی اکثریت میں ہوتی وہ برسر اقتدار رہتی ۔ ۱۸۸۶ء میں پہلی "ہیگ کانفرنس" ہوئی جسمیں ممالک یورپ کے جملہ اقوام نے شرکت کی اور اسپر غور و فکر و تجاویز پاس کئے گئے کہ امن سے حکومت کی جائے آپس میں جنگ و جدل نہ ہو ۔ اور اس پر کچھ عرصہ عمل پیرا رہے ۔ ہر ملک میں اس صدی میں قومیت کا احساس راسخ ہو چکا اور ہر ملک اپنی ترقی فلاح و بہبود کیلئے کوشاں رہا ۔ کچھ زمانہ امن سے گزرا تھا کہ جنگ عظیم چھڑ گئی ۔ بین الاقوامی تصور یورپ میں جنگ عظیم سے

قبل بھی تھا لیکن اس تخیل کو عمدہ روپ جنگ عظیم کے بعد ہی دیا گیا۔ جنگ سے تھک جانے اور نا قابل تلافی نقصان برداشت کرنے کے بعد جملہ اقوام نے مکرر اس پر غور کیا کہ آئندہ جنگ نہ ہو امن پسندی سے کام لیا جائے۔ اس کے چودہ اصول امریکہ کے صدر "ولسن" نے مرتب کئے۔ جنھیں ممالک یورپ نے پسند کیا اور اس کا عہد کیا کہ ایک دوسرے کی فلاح وبہبود چاہیں گے۔ امن کے قیام اور پرچار میں حصہ لیں گے۔ سوزرلینڈ کو غیر جانبدار ملک قرار دیکر اس کے شہر "جنیوا" میں جمعیت اقوام کی بنیاد ڈالی گئی، اس جمعیت کے اصول میں اس مرتبہ اتنی ترمیم ہوئی کہ اس مجلس کے رکن نہ صرف عیسائی ممالک بلکہ خود مختار ملک ہو سکتے ہیں جس کی بنا پر جاپان بھی رکن تسلیم کیا گیا "جمعیۃ اقوام" کو "خاندان اقوام" بھی کہا جاتا ہے اس کے قیام کے بعد سے اس وقت تک اس مجلس کو اپنے مشن میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے وہ اظہر من الشمس ہے سیاسی نقطہ نظر سے اس کو کامیابی نہ ہو سکی اس کی وجہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ مجلس اقوام کے اصول وضوابط اپنی جگہ عمدہ ہیں لیکن انکی خلاف ورزی ہو تو کوئی عاملانہ جماعت نہیں ہے جو ان پر سختی سے عمل کروائے یا اس خلاف ورزی کی سزا دے۔ ایسی صورت میں اس کا وجود وعدم مساوی ہے اگر ہر قوم کا اخلاقی معیار بلند ہو اور وہ حرص وآز کا شکار نہ ہو تو ظاہر ہے کہ جنگ کی نوبت ہی نہ آئے گی لیکن اسکی توقع رکھنا

عبث ہے۔ ابی سینا مجلس اقوام کی ناکامی کی ایک زندہ مثال ہے۔ البتہ مجلس اقوام کو بعض اصلاحی و تعمیری کام میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔ مثلاً مزدوروں کی حالت کی اصلاح، غلاموں کی تجارت کا انسداد وغیرہ۔

جنگ عظیم کے بعد سے سیاسی نقطہ نظر میں بے انتہا تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں کئی بادشاہ یکے بعد دیگرے معزول کئے گئے جمہوریت کا قدم مضبوط رہا ہے لیکن آمرین کی طرف تیزی سے قدم بڑھ رہا ہے۔ آمرین کے محاسن و معائب پر غور کرنا مقصود نہیں ہے تاہم اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ خود مختار حکومت اور آمرین میں صرف لفظی فرق ہے معنوی حیثیت سے دونوں ایک نظر آتے ہیں غرض کہ انسانی طبائع مختلف ہیں اور اقوام میں اس قانون قدرت کے تحت تبدیلیاں ہونا لازمی و ناگزیر ہے۔ فقط

خصوصیات قانون دستور انگلستان

ہر ملک میں کسی نہ کسی قسم کی حکومت ہوا کرتی ہے اور اس حکومت کا انحصار بیشتر وہاں کے روایات سیاسی ترقی اور فطری حالات پر ہوتا ہے۔ ہر منظم حکومت کا ایک آئین یا دستور ہوا کرتا ہے جو خاص

قواعد وضوابط سے عبارت ہوتا ہے جسمیں مقتدر اعلیٰ کا وجود شخص واحد ہو یا ایک جماعت، ضروری ہے ورنہ مملکت کا انتظام ناممکن ہونے کے علاوہ، وہ ملک ریاست کی تعریف میں ہی نہیں آسکتا۔

مقتدر اعلیٰ کا اب وہ تصور باقی نہیں رہا جو یورپ میں سولھویں و سترھویں صدی میں تھا۔ قدیم تصور کا ماحصل یہ ہے کہ "مقتدر اعلیٰ وہ ہستی ہے جس کا وجود ہر ملک کے لئے ضروری ہے اور اس کی قوت غیر محدود و غیر منقسم ہوتی ہے۔" لیکن فی زمانہ، ترقی سائنس و علوم کی وجہ سے انسانی مشاغل متعدد اور کثیر ہوگئے ہیں۔ حکومت جملہ فرائض انسانی کو انجام دے نہیں سکتی۔ اسلئے وہ چند اختیارات دوسروں کے تفویض کرتی ہے۔ جیسے جامعات، ریلوے، انشورنس کمپنیاں، تجارتی انجمنیں وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہر مقتدر اعلیٰ پر دو قسم کی تحدیدات ہوا کرتی ہیں۔ داخلی و خارجی۔ خارجی یہ کہ دوسرے خود مختار ممالک سے جو عہد نامہ جات ہوا کرتے ہیں ان کی پابندی لازمی ہے۔ داخلی یہ کہ ہر مقتدر ہستی خاص طریق پر حکومت کرتی ہے۔ من مانے احکام جاری نہیں کر سکتی۔ ہر انسان کا خاص مذہب و مفاد ہوا کرتا ہے جو مقتدر اعلیٰ کے حیطۂ اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ غرض کہ ہر شعبہ زندگی سے متعلق قوانین سازی ممکن نہیں۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس سے رعایا کی ذہنی ترقی رک جائے گی اور ایسے جزئی اوامر و نواہی سے انسان کی زندگی میکانیکی ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ سابقہ مفہوم مقتدر اعلیٰ

اب باقی نہیں رہا"۔

بعض مفکرین نے اقتدار اعلیٰ کی تقسیم بھی کی ہے۔ "قانونی مقتدر اعلیٰ" اور "سیاسی مقتدر اعلیٰ"۔ اعلیٰ قانون ساز منتخبہ جماعت "قانونی مقتدر اعلیٰ" ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے قوانین کوئی دوسری قوت منسوخ نہیں کر سکتی۔ وہ جماعت جو حق رائے دہی رکھتی اور اپنے نمائندوں کو منتخب کرتی ہے اس کی مجموعی حیثیت سے ایک خاص "شخصیت" ہوتی ہے جس کو "سیاسی مقتدر اعلیٰ" کہا جاتا ہے۔ رعایا براہِ راست حکومت نہیں کر سکتی، اسلئے ایک حکمراں جماعت کی ضرورت ہوتی ہے جو انتخاب کنندگان کی جانب سے مقرر ہوتی ہے۔ گویا اقتدار اعلیٰ ایک امانت ہے جو رعایا کی جانب سے ایک خاص جماعت کے سپرد کیجاتی ہے۔ اس مختصر تمہید کی روشنی میں ہم اپنے موضوع پر غور کریں گے۔

دنیا کی تواریخ میں، تاریخ انگلستان نہایت دلچسپ اور اپنی آپ نظیر ہے۔ بظاہر یہاں شخصی حکومت معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل جمہوریت اور محدود شخصی حکومت ہے۔ اس جمہوریت کی تشکیل اور شخصی حکومت کی تحدید، صدیوں کی انتھک کوشش، قربانی اور جدوجہد کا نتیجہ ہے نہ کہ بیک وقت یا کسی انقلاب یا قانون کے نفاذ کا نتیجہ۔ بادشاہ اور رعایا میں توازنِ اقتدار میں جو جدوجہد ہوئی اور رعایا کو انفرادی حقوق میں ترقی اور عوام اور جاگیرداروں کے مابین تفوق و برتری کی

کوشش اور مقدم الذکر کی بتدریج کامیابی جس طریق پر ہوئی وہ تاریخ انگلستان کا زرین باب ہے۔ اس نقطہ نظر سے تاریخ انگلستان دوسرے ممالک کے لئے ایک نمونہ ہے۔

دستور انگلستان کی کسی وقت تدوین نہیں ہوئی بلکہ یہ نتیجہ ہے ارتقاء کا۔ سوائے چند قوانین کے مثلاً میاگنا کارٹا۔ بل آف رائٹس وغیرہ جو بمقابلہ بادشاہ رعایا کے حقوق کے ضامن ہیں۔ یہاں کے دستور کا انحصار بیشتر روایات CONVENTIONS پر ہے۔ اسی لئے یہاں کا دستور غیر تحریری وتبدیل پذیر ہے۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ اس کے اہم مسائل سلجھانے میں بعض مرتبہ نہایت دشواری پیش آتی ہے۔ تاہم اس میں ایسی لچک موجود ہے کہ اہم دستوری تبدیلیاں بھی نامعلوم طریق پر ہوا کرتی ہیں اور ملک میں اس کی وجہ سے کوئی اختلاف یا ہیجان مثل ممالک متحدہ امریکہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور اسی لچک میں یہاں کے سیاسی استحکام کا راز مضمر ہے۔

اب ہم قانون دستور انگلستان کی خصوصیات پر ذرا تفصیل سے غور کریں گے:۔

(۱) انگلستان میں پارلیمنٹ یا شاہ باجلاس پارلیمنٹ مقتدر اعلیٰ ہے۔

(۲) تمام اشخاص قانون کی نظر میں یکساں ہیں۔

(۳) بہ طریق استقرار حقوق رعایا کے اصول اخذ کرنے کے علاوہ روایات کی اہمیت زیادہ اور اس کا پاس ولحاظ ضروری ہے۔ انگلستان میں

تنہا بادشاہ کی اہمیت سیاسی حیثیت سے زیادہ نہیں ہے۔ دستور میں اس کے اقتدارات خصوصی بہت کچھ ہیں، مگر عملاً بہت کم۔ کسی نے کہا ہے کہ انگلستان میں بادشاہ کی ہستی ایک "قانونی مغالطہ" ہے۔ گویا یہاں تنہا بادشاہ مقتدر اعلیٰ نہیں ہے بلکہ شاہ باجلاس پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہے۔ دارالعوام اور دارالامرا۔ ہر مسودہ کی تین مرتبہ خواندگی دونوں ایوانوں میں ہوتی ہے اور کوئی مسودہ بلا دستخط بادشاہ قانون نہیں بن سکتا۔ اگرچہ بادشاہ کو "حق تنسیخ" حاصل ہے تاہم اس کا استعمال بہت کم ہوتا ہے بلکہ ایسی کوئی مثال زمانہ حال میں نہیں پائی گئی۔ سیاسی امور میں بادشاہ کے متعلق یہ قیاس ہے کہ اس کے افعال کا ذمہ دار وزیر اعظم ہے۔ وزارت عظمیٰ کا دستور میں کہیں ذکر نہیں بلکہ یہ روایات کا نتیجہ ہے۔ انگلستان میں بادشاہت موروثی ہے۔ یہاں عورتیں بھی تخت کی دعویدار ہوسکتی ہیں۔ شاہ کے انتخاب کا حق پارلیمنٹ کو حاصل ہے یہاں کا بادشاہ پراٹسٹنٹ مذہب کا ہو اور اسی فرقہ میں شادی کرے۔ بوقت تخت نشینی حلف لینا ہوتا ہے کہ وہ دستور کے مطابق حکومت، روایات و قوانین کی حفاظت کرے گا اور قومی چرچ کی آزادی کا خیال رکھے گا۔ دارالعوام میں جس قدر اراکین ہوتے ہیں وہ رعایا کے منتخب ہوتے ہیں اور یہ قومی ذہن کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہاں کی پارٹیاں مذہبی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی، سماجی اور معاشی نقطۂ نظر سے قایم کی جاتی ہیں۔ بوقت انتخاب یہ پارٹیاں

ملک کے سامنے اپنا لائحہ عمل نفسیاتی طریق پر پیش کرکے زیادہ سے زیادہ آراء حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ پارلیمانی اراکین میں جو پارٹی اکثریت میں ہوتی ہے اس سے بادشاہ کا یہ فرمان ہوتا ہے کہ اس پارٹی کا لیڈر ایک کابینہ (مجلس انتظامی) ترتیب دے۔ چنانچہ اس پارٹی کا لیڈر اپنے ہم خیال اور موزوں اشخاص کو کابینہ میں شریک کرتا ہے گویا وزارت ترتیب دیتا ہے اور اس کا ہر رکن وزیر کہلاتا ہے۔ اس وزارت یا کابینہ کی تصدیق بادشاہ کرتا ہے۔ یہی کابینہ حکمراں جماعت ہوتی ہے اور وہ پارلیمنٹ کے سامنے ذمہ دار ہوتی ہے۔ کابینہ عاملانہ کام انجام دیتی ہے، یہ عاملانہ و مقننہ کی ایک کڑی ہے۔ ان میں سے کسی رکن کو دیگر اراکین کی رائے سے اختلاف ہو تو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ ہر رکن کابینہ ایک یا چند محکمہ جات کا صدر ہوتا ہے اور ان ہی میں سے ایک وزیر ہند بھی ہوتا ہے۔ ان کے تحت ایک مستقل عملہ ہوتا ہے جس کو کسی پارٹی سے تعلق نہیں ہوتا۔ کابینہ سیاسی حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔

دارالعوام اور دارالامراء کی بھی عجیب دلچسپ تاریخ ہے۔ اُنیسویں صدی تک دارالامراء کی اہمیت زیادہ تھی لیکن اس کے بعد سے اسکی اہمیت گھٹتی گئی اور دارالعوام کا اثر بڑھتا رہا۔ اس وقت دارالعوام کی خاص حیثیت ہے۔ سابق میں یہ عمل تھا کہ اگر کسی مسودہ کو دارالعوام میں (مرتبہ خواندگی کے دوران میں) نامنظور بھی کرتی تو دارالامراء اس کو مفید سمجھتی تو

پاس کرتی۔ بخلاف اس کے آجکل کوئی مسودہ دارالعوام میں پاس ہو اور اس کو دارالامراء نامنظور بھی کرے تو دارالعوام اس کو مفید سمجھنے پر پاس کر لیتی ہے۔ بالخصوص مالیاتی مسائل میں یہ ہو رہا ہے البتہ دارالامراء ترمیم پیش کر سکتی ہے۔ کبھی بادشاہ غور و فکر کے لئے مسودہ واپس بھی کرے تو اس پر بحث و تمحیص کے بعد دارالعوام مفید سمجھے تو بادشاہ کی مرضی کے خلاف بھی منظوری لی جاتی ہے۔ اگرچہ بادشاہ کو "حق تنسیخ" حاصل ہے لیکن اس کا استعمال کم ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ اراکین پارلیمنٹ کی تنخواہ سالانہ چارسو پونڈ ہوتی ہے۔ انھیں ریلوے پاس دیا جاتا ہے۔ ان مراعات کی وجہ غرباء بھی سیاسیات میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ہر رکن پارلیمنٹ 'یم' پی' کہلاتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ منتخب ہونیکے بعد قیام پارلیمنٹ یعنی پانچ سال تک مستعفی نہیں ہو سکتا۔ اِلّا یہ کہ وہ کہیں ملازم ہو جائے اور بوجہ ملازمت استعفیٰ پیش کرے۔ اس نشست کے لئے کسی اور کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ دارالامراء کی اب بھی اہمیت باقی ہے اس میں فن داں بھی ہوا کرتے ہیں۔ کوئی مسودہ ایسا پیش ہو۔ جس پر فنی اعتبار سے غور کرنا ہو تو ان ہی اراکین میں سے چند کی ایک منتخب کمیٹی قایم کرکے اس کے سپرد وہ مسئلہ کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ عدالتی مرافعہ کا اختیار اسی ایوان کو حاصل ہے۔ پارلیمنٹ کا افتتاح بادشاہ اسی ایوان میں کرتا ہے۔ اس ایوان میں زیادہ تر موروثی

امرا کی جماعت ہوتی ہے۔ سلطنت برطانیہ میں اب بھی اس کا اثر باقی ہے۔

مختصر یہ کہ انگلستان کے دستور میں "بادشاہ بہ اجلاس پارلیمنٹ" مقتدر اعلیٰ ہے اور یہی اعلیٰ قانون ساز جماعت ہے۔ جس کے قوانین کی تعمیل تمام پر لازمی ہے۔ کوئی انھیں منسوخ نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ امریکہ میں وفاقی عدالت مجاز کے ایسے قوانین جو خارج از اختیار طریق پر نافذ کئے گئے ہوں انھیں کالعدم قرار دے۔ تنہا بادشاہ یا دارالعوام یا دارالامرا اس اقتدار کے حامل نہیں ہیں بلکہ ان تینوں ہستیوں سے یہاں کا اقتدار اعلیٰ عبارت ہے۔ پارلیمنٹ سب کچھ کر سکتی ہے تاہم اس کے اقتدار اعلیٰ پر بھی داخلی و خارجی تحدیدات ہیں اور متذکرہ بالا اصول کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ ایسے قوانین نافذ نہیں کر سکتی جو اصول انصاف' یا قانون' یا قانون بین الاقوامی کے منافی یا متناقص ہوں۔ یا آنے والی پارلیمنٹ پر اس کا اثر ہو۔

بادشاہ کے اقتدارات خصوصی ہیں۔ سماجی حیثیت سے بادشاہ کی شخصیت اعلیٰ ہے۔ خارجی ممالک سے تعلقات قائم رکھ سکتا ہے' خطابات عطا فرماتا ہے' بری' بحری اور ہوائی افواج پر اس کا اقتدار ہے۔ وہ حکومت عاملانہ کا صدر ہے۔ حکومت کی پالیسی کا وہ پابند نہیں۔ مسودہ پر اس کی منظوری ضروری ہے۔ اعلان جنگ کر سکتا ہے۔

خارجی دُول سے معاہدات کرسکتا ہے۔ پارلیمنٹ برخاست کرسکتا ہے وغیرہ بادشاہ کے یہہ اقتدارات صدیوں کی نزاع کے بعد طے ہوئے ہیں بادشاہ کے بہت کچھ اختیارات سلب ہوچکے ہیں۔ حکومت عاملانہ کا وہ برائے نام صدر ہے۔ (وزیر اعظم صدر کابینہ) کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے بادشاہ کے افعال کا وزیر اعظم ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہاں کے دستور میں یہ تصور ہے کہ "بادشاہ سے غلطی سرزد نہیں ہوسکتی" بادشاہ پارٹی سے علحدہ اور مشورہ نیک دیا کرتا ہے۔ کابینہ بلحاظ حالات سیاسی تبدیل ہوتی رہتی ہے اور بادشاہ کو مختلف کابینہ کا تجربہ رہتا ہے۔ اسی لئے اس کے مشورہ کی قدر کیجاتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ "ہر شخص کے اختیارات یا حقوق دستور کا نتیجہ یا دستور کی بناء پر عطا نہیں کئے گئے ہیں بلکہ یہ خود دستور کی بنیاد ہیں۔ بخلاف اس کے دوسرے ممالک میں ایسے حقوق یا آزادی بطور ضمانت دی جاتی ہے مثلاً بلجیم میں مقننہ کے ذریعہ دستور مرتب ہوا ہے اور اسی کے مطابق حقوق عطا کئے گئے ہیں۔ اس خصوصیت کے تین تصورات ہیں:-

(۱) کوئی شخص قابل سزا نہیں جب تک اس سے قانون شکنی نہ ہوئی ہو اور عدالت میں وہ پیش نہ ہوا ہو۔ گویا یہاں جبری ARBITRARY قوت کا عدم وجود ہے۔ کوئی شخص نظر بند یا ملک بدر وغیرہ جو حکومت عاملانہ کے اختیارات ہوتے ہیں کسی ہستی سے

نہیں کیا جا سکتا بلکہ کسی سے قانون کی خلاف ورزی ہو تو اس کے مقابلہ میں باضابطہ عدالتوں میں چارہ جوئی اختیار کی جاتی ہے۔ فرانس کا بطل جلیل والٹیر اسی قسم کی قوت کا شدید ترین مخالف تھا۔

(ب) ہر شخص خواہ وہ کسی حیثیت کا ہو ملک کے معمولی قوانین کا تابع ہے۔

یہاں تمام کے لئے قانون ایک ہے کوئی امتیاز نہیں ہے۔ البتہ فرانس میں اب بھی امتیاز باقی ہے۔

(ج) شخصی اختیارات، استقرائی طریقہ سے حاصل ہوئے ہیں نہ کہ استخراجی طریق پر۔ یعنی انگلستان میں یہ تصور نہیں ہے کہ پہلے دستور مرتب ہوا اور اس کے بعد اختیارات عطا ہوئے بلکہ شخصی اختیارات ہی دستور کی بنیاد ہیں۔ علوم میں ترقی کی وجہ انسانی مشاغل میں کثرت ہو گئی ہے۔ حکومت رعایا کے جملہ مفاد کو پیش نظر رکھکر ہر شعبہ زندگی کے لئے قانون سازی نہیں کر سکتی۔ حکومت انگلستان اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے اس لئے یہاں بھی حالات متغیرہ کے تحت بعض کمپنیوں، تجارتی انجمنوں وغیرہ کو اختیارات عطا کئے گئے ہیں جنکی رو سے وہ قوانین وضع کرتے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں سزا اصادر کرتے ہیں۔ بعض کاروبار اور فنی معاملات اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ عدالتوں میں وہ مقدمات پیش ہوں تو صحیح طور پر انصاف نہیں ہو سکتا۔ ناانصافی سے محفوظ رکھنے کیلئے بعض سرشتوں کو

ایسے اختیارات عطا کئے گئے ہیں یعنے انگلستان میں آج کل فرانس کے قانونی انتظامی (DROIT ADMINISTRATIF) پر عمل ہو رہا ہے اور رجحان اس جانب بڑھتا جا رہا ہے بخلاف اس کے فرانس انگلستان کے حکومت قانون (RULE OF LAW) کی تقلید کا کوشاں ہے بالفاظ دیگر انگلستان میں قانون محکمہ جات کے تابع ہو رہا ہے (OFFICIALISED) تو فرانس کا قانون عدالتوں کے تابع (JUDICIALESED) تاہم یہ جاننا ضروری ہے کہ انگلستان میں فرانس کے قانون انتظامی کی بالکلیہ تقلید نہیں ہو رہی ہے فرانس میں تو عوام کا قانون کچھ اور ہے اور ملازمین سرکار کا اور یعنے ملازمین سرکار کے لئے قانون انتظامی ہے اور ان کے لئے عام عدالتیں نہیں بلکہ انتظامی عدالتیں قایم ہیں۔ لیکن انگلستان میں عدالتوں میں امتیاز نہیں ہے صرف بعض محکمہ جات کو اختیار عدالتی عملی سہولت کی بناء پر عطا ہوا ہے نہ کہ اصول قانون انگلستان کی ترمیم کے خیال سے فرانس میں عاملانہ کا اقتدار زیادہ ہے اور عدلیہ ان کے معاملات میں دخل نہیں دیتی انگلستان میں شخصی آزادی کا وہ ہے یہاں ایک قانون نافذ ہے جس کو HABEAS CORPUS ACT کہا جاتا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص محبوس کیا گیا ہو تو اس کی اطلاع کوئی شخص مجسٹریٹ کو دیسکتا ہے اور مجسٹریٹ فوری رہائی کا حکم WRIT صادر کرتا ہے رہائی کے بعد اس کے متعلق تحقیقات عمل میں آتی ہے۔

اس قانون کی موجودگی میں کوئی شخص نظر بند نہیں کیا جا سکتا بلکہ ہر جرم کی تحقیقات کے لئے عدالتیں موجود ہیں اور عام ضابطے کے سب پابند ہیں البتہ بزمانہ شورش یا فسادات اس قانون کو کچھ عرصہ کے لئے امن عامہ کے مدنظر معطل کیا جاتا ہے تو دوسرے قانون رعایت ACT OF INDEMNITY کا بھی نفاذ کیا جاتا ہے تا حکومت عاملانہ کو یقین ہو کہ ان کی حفاظت ان کے غیر قانونی عمل پر جو غیر معمولی زمانہ و حالات میں کرنی پڑتی ہے، کی جائے گی۔ اس کے باوجود اگر حکام بیجا یا ضرورت سے زیادہ سختی سے کام لیں تو ایسے عہدہ دار اس قانون کے تحت رعایت کے مستحق نہ ہو سکیں گے اسی طرح یہاں آزادی تحریر و تقریر بھی کافی ہے۔ ہر شخص جو چاہے کہہ اور لکھ سکتا ہے بشرطیکہ اس سے کسی کی توہین نہ ہو۔ یہاں کے اخبارات بلا لائیسنس طبع ہوتے ہیں سینسر قایم نہیں ہے یہاں اخبار شائع کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی خانگی خطوط لکھ رہا ہو صرف ملکی توانین کی خلاف ورزی نہ ہو۔ حق انعقاد مجالس عام بھی رعایا کو حاصل ہے جس موضوع پر چاہے بحث اور جلسہ عام منعقد کر سکتے ہیں۔ اگر جلسہ سے امن عامہ میں خلل ہو یا قانون شکنی اس جلسہ کا مقصد ہو تو روک دیا جائیگا۔ ایسے مجمع کے فرو کرنے میں نہ صرف ملازمین سرکار بلکہ رعایا پر بھی ذمہ داری ہوتی ہے ایسے موقع پر ہر شخصی ذمہ داری کا تصور ہے یعنے یہ کہ کوئی شخص (حاکم) خلاف قانون حکم دے اور کوئی اس کی تعمیل کرلے تو اس فعل کا

ذمہ دار، فعل کا انجام دینے والا ہوگا نہ کہ حکم دینے والا۔ غرض کہ قانون دستور انگلستان کی دوسری خصوصیت یعنے حکومت قانون نہایت اہم اور دیگر متمدن ممالک کیلئے ایک احسن نمونہ ہے۔

(۳) تیسری خصوصیت روایات کی اہمیت ہے۔ انکی تعداد کافی ہے یہ روایات غیر تحریری اور غیر قانونی ہوتی ہیں یعنے عدالتوں کے ذریعہ ان کا نفاذ نہیں کروایا جاتا۔ تاہم ان پر عمل ہوا کرتا ہے۔ دستوری روایات کی حیثیت سیاسیات میں ایسی ہی ہے جیسے سماج میں رسم و رواج کی۔ رسم و رواج کی پابندی کسی قانون کے ذریعہ نہیں ہوا کرتی بلکہ رائے عامہ یا سماجی بائیکاٹ کے خوف سے ان کی تعمیل ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح روایات کی بنیاد سمجھوتہ پر ہوتی ہے اور یہ ایک قسم کی دستوری مفاہمت ہے۔ قانونی مقتدر اعلیٰ پارلیمنٹ اور سیاسی مقتدر اعلیٰ انتخاب کنندگان یعنی ان دونوں میں مطابقت پیدا کرنا ضروری ہے۔ جماعت مقننہ پر روک قانون کی نہیں روایات کی ہے اس لئے رعایا کے اقتدار اعلیٰ کا تحفظ روایات کرتی ہیں۔ اگر ملک کی رائے پارلیمنٹ کی رائے سے مختلف ہو تو تاج (بادشاہ) اختیار خصوصی کی بناء پر پارلیمنٹ برخاست کرتا ہے دراصل برخاست ایک اپیل ہے جو قانونی مقتدر اعلیٰ کی جانب سے سیاسی مقتدر اعلیٰ کے پاس کیا جاتا ہے اور اس کی غایت مطابقت پیدا کرنا ہے رائے عامہ، پارلیمنٹ سے یہ توقع کرتی ہے کہ

روایات کی پابندی ہوگی ورنہ وہ اس کو بوا سمجھتی ہے روایات مثال کے طور پر یہ ہیں - ہر مسودہ کی تین مرتبہ خواندگی ہوتی ہے دارالامراء مالیاتی مسودات پیش نہیں کر سکتے دار العوام میں وزرا کا اعتماد نہ ہو تو وہ مستعفی ہو جاتے ہیں ہر سال پارلیمنٹ کا افتتاح دارالامرا میں ہوگا وغیرہ - مختصر یہ کہ پارلیمنٹ کا ضابطہ روایات کا مجموعہ ہے اور دستور میں روایات کو نہایت اہمیت ہے -

ف - بالآخر اس کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کا دستور تبدیل پذیر ہونے کی وجہ سے اس میں اہم تغیرات نامعلوم طریق پر ہوتے رہتے ہیں - کبھی یہ خیال تھا کہ سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا لیکن اب وہ حالت نہیں رہی پارلیمنٹ کا جو اقتدار نو آبادیات پر ابتدا میں تھا وہ ۱۸۸۴ء سے کمزور ہوتا چلا جنگ عظیم کے بعد سے اس کے نو آبادیات کاملاً خود مختار ہو چکی ہیں - وہ داخلی اور خارجی معاملات میں خود مختار ہیں - البتہ اب آپسمیں یعنے کینا ڈا نیوزیلینڈ جنوبی آفریقہ - آسٹریلیا اور سلطنت انگلستان میں دوستانہ تعلقات ہیں اور اخلاقی ذمہ داری باقی رہی ہے نہ کہ قانونی یہ دستور کی خوبی ہے کہ باوجود ان اہم تغیرات کے عام طور پر رعایا کو اسکا احساس نہیں ہوتا - سلطنت برطانیہ میں ہندوستان ہی ایک ایسا بدنصیب ملک ہے جس کو ابھی تک نو آبادی درجہ بھی حاصل نہیں ہوا صرف داخلی امور میں کسی قدر اختیارات حاصل ہوئے ہیں -

ہندوستانی سیاسی مدّوجزر

ہندوستان جغرافیائی حیثیت سے ایک وسیع ملک ہے اسکو براعظم کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ حکومت برطانیہ نے اسکی سیاسی تقسیم برطانوی ہند اور ہندوستانی ہند میں کی ہے۔ ہندوستانی ہند یعنی دیسی ریاستوں سے اس مضمون کو کوئی تعلق نہیں۔ برطانوی ہند کی رعایا سیاسی آزادی حاصل کرنے اور دنیا کے متمدن اور خود مختار ممالک میں شریک کئے جانے کے لئے عرصہ سے کوشاں ہے۔ اسی سیاسی جدوجہد اور بیداری کو مختصراً اظاہر کرنا مقصود ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب اس خصوص میں پہلا قدم ہے اور وہ سیاسی شعور کا نتیجہ تھا۔ لیکن یہ خیال بالکلیہ صحت پر مبنی نہیں ہے اس لئے کہ اس انقلاب کے اور بھی وجوہ تھے۔ سلطنت مغلیہ کی حالت چراغ سحری کی تھی۔ ہندوستان میں کوئی مرکزی قوت نہ تھی اور نہ رعایا کے پیش نظر کوئی سیاسی مطمح نظر۔ غیر منظم اور غیر سیاسی طریقہ کی یہ کوشش ایسی ہی تھی جیسے ڈوبتا ہوا شخص تنکے کا سہارا لینا چاہے۔

یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قیام کانگریس (۱۸۸۹ء) سے اسکی

سیاسی سرگرمی اور قومی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوستانیوں کے جمود کو توڑنے اور ان میں قومی احساس پیدا کرنے میں چند انگریز مدبرین نے حصہ لیا۔ ان ہی کی ہمدردی مشورہ اور ذاتی دلچسپی قیام کانگریس کا باعث ہوئیں۔ مسٹر ہیوم اور دیگر انگریز حضرات کا ہندوستان مرہون منت ہے اور ان حضرات کی عظمت اور یاد ہندوستانیوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہیگی۔ اسی لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی سیاسی بیداری کا تخم انگریز مدبرین نے بویا۔

کانگریس کے ابتدائی جلسوں کے خطابات اور رزولیوشن پر غور کرتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک تعلیمیافتہ طبقہ کی جماعت ہے جس کے دل میں حکومت برطانیہ کی عظمت ہے۔ اور وہ اپنی سیاسی بیداری کو برطانوی حکومت اور انگریزی تعلیم کا نتیجہ سمجھتی ہے وہ ایک وفادار جماعت معلوم ہوتی ہے۔ صدارتی خطبات میں جابجا حکومت برطانیہ کی تعریف کیجاتی تھی۔ اس ابتدائی دور میں ہندوستانی مدبرین کی یہ کوشش رہی کہ آئینی طریق پر اپنے مطالبات کو پیش کریں اور حقوق حاصل کریں۔ اسی سیاسی مسلک کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انگریز مدبرین اور اراکین پارلیمان نے نہ صرف ہندوستانی سیاسی مسائل میں دلچسپی لی اور ہمدردی کی بلکہ کانگریس کی صدارت قبول فرماکر اس کی کوششوں میں عملی حصہ لیا۔ جنگ عظیم نے اکثر ممالک کی سیاسیات کا نقشہ

بدل دیا۔ ان ہی میں ہندوستان بھی ایک ہے جنگ عظیم سے قبل حکومت برطانیہ نے یہ وعدہ کیا اور یقین دلایا کہ ختم جنگ پر ہندوستان کو خودمختاری عطا کیجائیگی۔ اسی توقع پر بعض مدبرین نے کافی امداد بہم پہنچانے پر رضامندی ظاہر کی اور بعض نے اختلاف بھی کیا لیکن ان کی آواز صدا بصحرا ہو کر رہی غرض کہ حکومت سے تعاون کیا گیا۔ ممکنہ امداد دیگئی۔ اس قدر ایثار و امداد کے باوجود ختم جنگ پر حکومت نے ہندوستانیوں کے مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اس غیر متوقع برتاؤ کی وجہ سے برطانوی ہند میں بے چینی پھیلنی شروع ہوئی۔ صلحنامہ ورسائی میں ترکوں کے ساتھ ناانصافی کیگئی تھی۔ اور مسئلہ خلافت بھی اسی زمانہ میں چھڑا جس سے مسلمانوں کو مذہبی عقاید کے لحاظ سے دلچسپی تھی۔ کانگریس نے مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کی تائید کی اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ جس کی وجہ مسلمان کثیر تعداد میں کانگریس میں شریک ہوئے۔ مسلم لیگ اور کانگریس نے متحدہ طور پر برٹش گورنمنٹ کے خلاف کام کرنا شروع کیا۔ کانگریس یا قومی تحریک کا یہ دوسرا دور تھا جس میں حکومت کے خلاف عملی کام شروع کیا گیا۔ تحریک ترک موالات کا آغاز ہوا۔ خلافت اور نان کوآپریشن تحریکات نہایت شدت اور سرعت سے ملک میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ ہندو مسلم اتحاد کا جو مظاہرہ اس زمانہ میں ہوا اسکی مثال پچھلی تاریخ پیش کر سکتی ہے اور نہ آئندہ یہ ممکن ہے۔

ہزاروں ہندوستانی جیل چلے گئے۔ معصوم بچوں اور عورتوں پر

مشین گن چلائی گئی۔ سزا، تازیانہ دیگئی۔ غرضکہ حکومت نے ان تحریکات کو کچلنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ استبدادیت کا جو مظاہرہ حکومت نے کیا اسکی مثال تاریخ میں بمشکل ملسکتی ہے۔ یہ محض اس لئے کیا کہ ہندوستانیوں کو ان کا پیدائشی حق یعنے آزادی نہ دی جائے اور اپنے عدم ایفائے عہد کے عمل کو نبھائے۔ برطانوی حکومت اس زمانہ میں یوں بھی پریشان تھی کہ اسکی حالت ایک تھکے ہوئے سپاہی کی تھی۔ جنگ عظیم نے اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ امن وسکون سے حکومت کرے۔ حکومت نے تشدد سے بھی کام لیا۔ نیز مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کو ہندوستان بھجوایا کہ وہ ہندوستانی سیاسی لیڈروں سے ملاقات کریں اوران کے مطالبات پر غور اور ہندوستانی سیاسی حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ایسا دستور مرتب کریں جو ہندوستانیوں کے لئے رفتہ رفتہ خود مختاری عطا کرنے کا ضامن ہو۔

چنانچہ "مانٹ فورڈ" اصلاحات عمل میں لائے گئے معافی عامہ دیگئی ان کی رو سے ہندوستانیوں کو چند اختیارات عطا کئے گئے اور انھیں ملکی معاملات میں کسی قدر دخل حاصل ہوا۔ ہندوستانی دستوری ارتقاء میں اس دستور کا خاص اثر ہے۔ اس کی رو سے جداگانہ انتخاب جائز رکھا۔ بعض فرقوں کے لئے نشستوں کا تحفظ کیا گیا نامزدگی کو جائز رکھا۔ باوجود اس کے فوج اور مالیہ کو کوئی اختیار عطا نہیں کیا گیا۔ یہ وہ دستور ہے جو ۱۹۳۷ء یکم اپریل تک ہندوستان میں کارفرما رہا۔

اس سے بھی ہندوستانی مطمئن نہ تھے ان کا خیال تھا کہ جائز حقوق عطا نہیں کئے گئے۔ اس زمانہ میں بھی یہ مسئلہ درپیش رہا کہ کونسل اور اسمبلی میں کانگریس شریک ہو یا نہ ہو۔ ایک جماعت "سوراج پارٹی" پنڈت موتی لال آنجہانی کی قیادت میں تیار ہوئی جو شرکت کی حامی تھی۔ آخر غلبہ اسی جانب رہا اور کانگریس نے عملی حصہ لیا۔ اس جماعت کا خیال تھا کہ اس میں شریک ہو کر زک دیجائے۔ یعنے مقابلہ داخلی ہو نہ کہ خارجی گورنمنٹ کے مسودات کو نامنظور کیا جائے۔ غرض کہ یہ ایک آئینی طریقہ جد وجہد کا تھا۔ لیکن اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اس لئے کہ گورنر جنرل کو "حق تنسیخ" حاصل تھا۔ جسکی رو سے وہ جس مسودہ کو چاہے نامنظور کر سکتا تھا۔ بالآخر ۱۹۲۶ء میں یہ پارٹی گورنمنٹ اصلاحات کی کمیٹی قایم کرنے کے بعد انکار کرنیکی وجہ کونسل و اسمبلی سے علیحدہ ہوئی۔ اس زمانہ سے یعنے "مانٹ فورڈ" اصلاحات عمل میں آنے کے بعد سے ہندوستانیوں نے حکومت پر علی الاعلان کونسل اور اسمبلی میں نکتہ چینی شروع کی۔ حکومت پر سخت سے سخت حملے کئے جاتے تھے۔ لیکن دستوری ارتقا کی بنا پر حکومت مجبور تھی۔

۱۹۲۱ء کے بعد کا زمانہ ایسا رہا جبکہ سنجیدہ لیڈر تمام جیل میں تھے یہ زمانہ کانگریس کے لئے نزاج کا تھا۔ چند خود غرض اور تنگ نظر اشخاص نے خود کو لیڈر ظاہر کیا اور فرقہ وارانہ زہر پھیلانا شروع کیا۔ تبلیغ مہا بھائی تحریکات شدھی۔ سنگھٹن کے نام سے ہندوستانی قومی تحریک کا

بھینٹ چڑھانا شروع کیا۔ ۲۔ نو سال تک ان خیالات کو بہت فروغ رہا۔ ہندو مسلم اتحاد فرقہ وارانہ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوا۔ اکثر شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہوئے۔ غرضکہ اس عرصہ میں ہندوستانی سیاسی افق دھندلی رہی۔ قومی تحریک اور قومی مطمح نظر بھلا دیئے گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت سے مقابلہ کرنے کے لئے ہندوستانی سیاسی طور پر تیار نہ تھے۔ لیڈران نے غلط اندازہ کرکے تحریک عدم تعاون شروع کردی تھی۔ غرضکہ جیل سے رہائی پانے کے بعد لیڈروں نے دیکھا کہ سیاسی نقشہ بدل گیا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ جو کہ حصول آزادی کے لئے شرط مقدم ہے نہایت نازک بن گیا تھا۔ ممکنہ کوشش کی گئی۔ گاندھی جی نے فاقہ کیا کہ کسی طرح اتحاد قایم ہو۔ اس کوشش میں ایک حد تک کامیابی ضرور ہوئی تاہم ایک ایسی فرقہ پرست جماعت (مہا سبھا) قایم ہوئی جو علی الاعلان مسلمانوں کی مخالفت کرنے لگی۔ لیکن اس زمانہ میں اس جماعت کا کانگریس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور کانگریس فرقہ پرستی سے بالا تھی۔ وہ قومی مسلک پر بدستور سختی سے قایم تھی۔ ہندوستانی سیاست داں اس سے نمٹنے نہ پائے تھے کہ اس زمانہ کے وزیر ہند "لارڈ برکن ہیڈ" نے ہندوستانیوں کو چیلنج دیا کہ "اگر ہندوستانی مانٹ فورڈ اصلاحات سے ناخوش ہیں اور خود کو اس سے زیادہ حقوق کے مستحق سمجھتے ہیں تو وہ ایک ایسا جامع دستور تیار کریں جو ہندوستان کے تمام فرقوں کے لئے قابل قبول ہو۔

کانگریس نے اس چیلنج کو قبول کیا اور ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس طلب ہوئی جس کے صدر پنڈت موتی لال آنجہانی تھے۔ کافی غور وفکر بحث وتحیص کے بعد "نہرو رپورٹ" تیار ہوئی۔ اس وقت تک اقلیتوں کا مسئلہ اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ نراج کے زمانہ کے حالات سے اقلیتیں اکثریت سے خائف ہوئیں اور انھیں عدم اطمینان رہا۔ مسلمانوں نے دیگر اقلیتوں کے ساتھ ہمدردی کی اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے بھی کوشش کی۔ اس عمل کو کانگریس نے اچھی نظروں سے نہ دیکھا۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ مسلمان خندہ پیشانی سے میثاق لکھنو کی ۱۹۱۶ء میں تکمیل کی جس کی رو سے مسلمانوں کی بعض صوبوں کی اکثریت اقلیت میں بدل دی گئی تھی۔ لیکن اب اکثریت کی ذہنیت سے اقلیتیں خائف ہوئیں۔ "منٹو مارلے رفارم" یعنے اصلاحاتِ کے تحت اقلیتوں کو تلخ تجربہ حاصل ہوا تھا جس کا اعادہ اس وقت ہونے لگا۔ مسئلہ انتخاب (مخلوط ہو یا جداگانہ) تحفظ نشست وغیرہ مسائل مابہ النزاع رہے۔ کافی پروپگنڈا فریقین کی جانب سے ہوا۔ جذبات ناراضگی کا مظاہرہ کافی ہوا۔ "نہرو رپورٹ" کو مسلمان اور سکھ نے تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ پست اقوام نے بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ کانگریس کے ایک سنجیدہ طبقہ نے بھی اس کو اسلئے پسند نہ کیا کہ اسمیں "مستعمراتی درجہ" "ڈومنین اسٹیٹس" کو مطمح نظر قرار دیا تھا۔ حالانکہ ایک جماعت کامل "خود مختاری" کی حامی تھی نتیجہ اس تمام مخالفت کا یہ ہوا کہ "نہرو رپورٹ"

مسترد کر دیگئی برطانوی مدبرین کو طعنہ زنی کا موقع ملا۔ اسی زمانہ میں مسلمانوں کی جانب سے مسٹر محمد علی جناح نے "چودہ مطالبات" کانگریس کے سامنے پیش کئے تھے جنھیں تسلیم کرنے سے کانگریس نے انکار کیا غرض کہ آپسمیں خلیج اختلاف وسیع سے وسیع تر ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ملک میں کافی بے چینی تھی۔ بجائے حکومت کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانیکے آپس میں ہی مناقشہ ہوتا رہا قومی تحریک بھلا دیگئی تھی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر حکومت نے "سائمن کمیشن" ہندوستانی سیاسی حالات کا مطالعہ کرنے اور اصلاحات کی سفارش کرنیکے لئے بھجوایا۔

باوجود اختلافات کے تمام جماعتوں نے اس کمیشن کے مقاطعہ میں حصہ لیا۔ موثر طریق پر اس کا مقاطعہ کیا۔ یہ عمل حکومت کے لئے ناقابل قیاس تھا۔ تمام جماعتیں متحد ہوئیں۔ اور موثر طریق پر حکومت سے مقابلہ کرنے کے تدابیر سوچے جانے لگے۔ اس موقع پر کانگریس نے تحریک عدم تعاون سے زیادہ سخت طریقہ "سیول نافرمانی" کا اختیار کیا قانون شکنی شروع کر دیگئی مگر یہ عمل عدم تشدد کے مسلک پر قایم تھا۔ گاندھی جی کی قیادت میں اس تحریک کو ایک حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ مولانا محمد علی مرحوم اس تحریک کے مخالف تھے اسی لئے مسلمانوں نے اس میں زیادہ حصہ نہ لیا۔ طبقہ نسوان نے اپنی ہمت، استقلال اور ایثار کا کافی ثبوت دیا۔ ہزاروں اشخاص نے سزا پائی، مار کھائی،

جان دی۔ اس تحریک سے عوام بھی متاثر ہوئے اوران میں بھی قومی احساس پیدا ہوا ۔ اُس زمانہ کے وائسرائے لارڈ اِرون (موجودہ لارڈ ہیالی فیاکس) اور گاندھی جی میں سمجھوتہ ہوا جس کی رو سے تمام سیاسی قیدی رہا کئے گئے۔ کانگریس کے مطالبات سے انھوں نے ہمدردی ظاہر کی اور کانگریس کو گاندھی جی کی حیثیت کانگریس میں آمر کی سی تھی اور ہے) آمادہ کیا کہ وہ اپنا نقطۂ نظر گول میز کانفرنس میں پیش کرے جس کا انعقاد سائمن کمیشن کے بعد انگلستان میں ہوا تھا۔ پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کیا گیا تھا دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس نے گاندھی جی کی قیادت میں شرکت کی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی تمام جماعتوں کے نمائندے شریک تھے۔ حتی کہ والیان ریاست کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اس کانفرنس کے ذمہ ہندوستان کے لئے جدید دستور مدون کرنا تھا اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستانی نمائندوں سے حل نہ ہو سکا۔ مولانا محمد علی مرحوم نے پہلی کانفرنس کے موقع پر بے انتہا کوشش کی کہ کسی طرح کوئی بہتر حل نکل آئے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دوسری کانفرنس کے موقع پر یہ مسئلہ مجبوراً اس زمانہ کے وزیر اعظم مسٹر ریمزی میاکڈانلڈ کے سپرد کیا گیا جنھوں نے "کمیونل، وارڈ" صادر کیا۔ اس فیصلہ کی رو سے مسلمانوں کو ایک حد تک ان کے حقوق حاصل ہوئے۔ پنجاب، بنگال، صوبہ سرحد اور سندھ (تقسیم سندھ کی تحریک قبول کرنے کی وجہ) میں مسلمانوں کی

جائز اکثریت رہی۔ سکھ اور ہندوؤں کے لئے یہ فیصلہ ناقابل قبول رہا۔ پست اقوام کا تحفظ بھی اس کی رو سے کیا گیا لیکن گاندھی جی نہیں چاہتے تھے کہ اعلیٰ ہندوؤں سے پست اقوام علیحدہ تصور کئے جائیں۔ اور ان کی ایک علیحدہ سیاسی جماعت ہو۔ اس کی ناراضگی کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا کہ "میں اسکے لئے اپنی جان کی بازی لگا دونگا" چنانچہ بعد میں انھوں نے اس کے لئے پھر برت رکھا تھا۔ مہا سبھائیوں نے شدت سے مخالفت کی۔ یہ وہ مسئلہ تھا جس پر کانگریس کی اکثریت، مہا سبھائیوں کی ہم خیال رہی۔ مسلمانوں کو یہ فرقہ وارانہ فیصلہ قابل قبول تھا (اگرچہ اسکی رو سے انکے جملہ جائز حقوق عطا نہیں ہوئے تھے) تا آنکہ کوئی دوسرا بہتر حل اس کے بجائے پیش ہو۔ یہی وہ مسئلہ اور وقت ہے جبکہ کانگریس اپنے میں مہا سبھائی اسپرٹ ضم کرنے لگی اس رجحان سے مسلمان کانگریس سے بدظن ہوئے اور علیحدگی اختیار کرنی شروع کی بنگال میں دہشت انگیزوں نے تحریک شروع کی اس سے بہت کچھ برطانوی حکومت کو نقصان بھی پہنچا۔ کانگریس کو اندرونی طور پر اس تحریک سے بھی ہمدردی تھی۔ اسی لئے کہا گیا کہ "کانگریس فرقہ واریت اور اشتراکیت کا عجیب مجموعہ ہے"۔

تیسری گول میز کانفرنس یا دیگر جلسوں میں کانگریس نے شرکت نہ کی۔ لارڈ ولنگڈن ہندوستان کے وائسرائے منتخب ہوئے۔

بیثاق گاندھی ارون کی رو سے سیول نافرمانی ملتوی کی گئی تھی جس کو کانگریس شروع کرنا چاہتی تھی کہ وائسرائے نے کانگریس اور اسکی متعلقہ تمام جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیکر تمام کانگرسی دفاتر اور جائداد ضبط کرلی، کئی لیڈر نظر بند کئے گئے۔ جیل بھیجے گئے۔ قلیل عرصہ میں حکومت کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس اسپرٹ کو دبادیا لیکن اس تمام عمل ورد عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو اثر رعب وداب انگریزوں کا ہندوستانیوں پر تھا وہ نفرت اور برہمی سے بدل گیا۔ اس وقت تک کانگریس کا خیال یہ تھا کہ "کمیونل واڈر" کو تسلیم کیا جائے نہ کہ سترد۔ ۱۹۲۸ء میں ہی خود مختاری کا اعلان کیا گیا تھا لیکن "ڈومنین سٹٹیس" کی ہی حامی تھی۔ کانگریس ہریجن تحریک وغیرہ فرقہ واری مسائل میں دلچسپی لینے لگی۔ گاندھی جی نے بظاہر کانگریس سے علیحدگی اختیار کی لیکن اس وقت تک عنان کانگریس انہی کے ہاتھ میں ہے اور انکی حیثیت آمرانہ ہے۔

ایک جانب حکومت ہند تشدد کے ذریعہ سیاسی تحریک کو ختم کرنے کی کوشاں تھی اور دوسری جانب حکومت برطانیہ جدید دستور کی تدوین میں مصروف تھی، بالآخر ۱۹۳۵ء میں بزمانہ سرسیمویل ہور وزیر ہند "قانون ہند" وضع ہوا، جس کا نفاذ ۱۹۳۷ء یکم اپریل سے ہوا۔ عام طور پر کانگریسی اس قانون کے مخالف تھے لیکن ایک جماعت ایسی تیار ہوئی جو داخلی مقابلہ کی حامی تھی۔ اس جماعت کا خیال ہیکہ

کونسل اور اسمبلی میں داخل ہوکر ان اصلاحات کو بے اثر کردیں چنانچہ "شرکت کونسل" کے خیال کو تقویت ہوئی اور کانگریس نے انتخابات میں حصہ لیا اور اس میں اسکو کامیابی حاصل ہوئی۔ منجملہ گیارہ صوبوں کے سات صوبوں میں کانگرسی اُمیدوار منتخب ہوئے اور ان کی اکثریت رہی، پھر یہ مسئلہ عرصہ تک معرض بحث میں رہا کہ اس دستور کے تحت عہدے قبول کئے جائیں یا نہیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ عہدے قبول کئے جائیں چنانچہ سات صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہیں جدید دستور کے تحت جو تبدیلیاں ہوئیں وہ یہ ہیں۔ صوبہ واری خودمختاری۔ وفاق۔ صوبہ واری خودمختاری کی حد تک یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے عمل ہورہا ہے۔ وفاق کے متعلق ایک جماعت کا خیال ہے کہ چند ترمیمات کے ساتھ اس کو قبول کرلیا جائے جس شکل میں اسوقت وفاق موجود ہے وہ کسی جماعت کے لئے قابل قبول نہیں ہے اس وقت ہمیں جدید دستور کے محاسن و معائب پر غور کرنا نہیں ہے بلکہ ملک کے عام سیاسی رجحانات کی کانگریس کے نصب العین کی روشنی میں جانچ کرنا ہے۔

حالات حاضرہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں اقلیتیں غیر مطمئن ہیں۔ جن صوبوں میں کانگریسی وزارت قایم ہے وہاں کی بالخصوص مسلم جماعت ناخوش ہے۔ بحیثیت مجموعی مسلم لیگ کی یہ رائے ہے کہ کانگریس نے اپنے نصب العین کو بھلادیا ہے اور وہ فرقہ پرست ہوگئی ہے۔ مہاسبھائی اثر اس پر غالب ہے اسکا

پروگرام اب قومی نہ رہا بلکہ فرقہ وارانہ مسلم لیگ خود کو ہندوستانی مسلمانوں
کی واحد نمائندہ جماعت بتلاتی ہے، لیکن کانگریس اس کی حیثیت کو
تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے، لیکن کانگریس اس کے متعلق ساکت
ہے کہ اس کا نصب العین فرقہ وارانہ ہو چکا ہے۔ مسلم لیگ اس کے
لئے چیلنج دے رہی ہے۔ کانگریس اس اعتراض کا جواب دینے سے
گریز کر رہی ہے، مسلمانوں نے نہایت حزم و احتیاط سے سیاسیات
میں قدم رکھا۔ قیام کانگریس کے باوجود ۱۹۰۶ء تک مسلمانوں نے کوئی
اہم حصہ سیاسیات میں نہ لیا، البتہ منٹو مارلے رفارم کے وقت انھوں نے
مسلم لیگ قایم کی۔ سیاسیات ہند میں ان کا یہ پہلا قدم تھا۔ ۱۹۱۶ء
میں میثاق لکھنو عمل میں آیا جس میں مسلم لیگ کو واحد نمائندہ جماعت تسلیم
کیا گیا ہے اس وقت اس کی اس حیثیت سے انکار کرنا قابل غور ہو جاتا
ہے۔ لکھنو میں دونوں اہم سیاسی جماعتوں کا اتحاد عمل میں آیا تھا۔
بالآخر اسی مقام پر اختلاف شروع ہوا۔ باوجود صلح و مفاہمت کی گفتگو
کے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا مسلم لیگ کا کانگریسی وزارت کی نسبت اور
عام پالیسی کے متعلق یہ عذر ہے کہ وہ فرقہ واریت میں آگئی ہے
جسکی تائید میں وہ "صوبہ متوسط کی ودیا مندر اسکیم" ہندی زبان اور
ناگری رسم الخط کی ترویج، بندے ماترم کو قومی گیت تصور کرنا۔ وزارت
بمبئی کا لوکل بورڈ کے متعلقہ قوانین میں ترمیم کرنا نیز اسی قبیل کی بیسیوں
مثالیں پیش کرتی ہے مختصر یہ کہ ہندوستان میں عام طور پر بے چینی و بے اطمینانی

پھیلی ہوئی ہے۔ کانگریس نے ترقی معکوس کی ہے "قوم پرستی سے نکل کر فرقہ واریت کے بھنور میں پھنس گئی ہے۔ قومی نصب العین کو بھلا دیا گیا ہے جب تک کہ اکثریت اقلیتوں کو مطمئن نہ کر لے، ہندوستان کو خودمختاری حاصل ہونا تقریباً ناممکن ہے فقط

ہندوستانی کانگریس کا اصول اور عمل

قبل ازیں ایک مضمون "ہندوستانی سیاسی مد و جزر" کے عنوان سے لکھا گیا تھا جس میں "انڈین نیشنل کانگریس" کی پنجاہ سالہ تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ کانگریس اپنے مسلک پر قایم نہیں رہی۔ فی الوقت اس کے اصول اور عمل میں بعد المشرقین ہے۔ اسی پہلو کو اجاگر کرنا مقصود ہے ورنہ مفہوم تشنہ رہے گا۔ منشا یہ نہیں کہ کسی کی شخصیت یا جماعت پر حملہ کیا جائے بلکہ واقعات پیش شدہ کا اظہار ہو اور قومی تحریک کی کسوٹی پر ان کو جانچ کیجائے۔

کانگریس کے مسلک سے کسی ہندوستانی کو انکار ہو سکتا ہے اور نہ اختلاف۔ بانیان ہندوستانی کانگریس کی نیت نیک اور ان کی کوششیں مستحسن تھیں۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ آخر وہ کون اسباب ہیں

جن کی وجہ اب کانگریس اپنے مسلک پر قائم نہیں ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کرے کہ اب بھی وہ بدستور قدیم نصب العین پر قایم ہے تو ان سے مودبانہ معروضہ ہے کہ وہ بغور روزانہ اخبار کا مطالعہ کریں اور قومی نصب العین کی کسوٹی پر نام نہاد کانگریسیوں کے عمل کو جانچیں۔ فی زمانہ یہ اسلئے ضروری ہے کہ کہیں یہ قومی جماعت قومیت کے روپ میں نیک نفس ہندوستانیوں کو گمراہ نہ کر دے اور بجائے ترقی کے پستی کی طرف نہ لے جائے، بجائے اتحاد کے انتشار اور بجائے آزادی کے غلامی کی زنجیر اور مضبوط نہ کر دے۔ اسی لئے ہر ہندوستانی کا یہ فریضہ ہے کہ ایسی اہم اور ذمہ دار جماعت کے عمل کا سختی سے جائزہ لے، اس کی پالیسی پر تنقید کرے، اس کی غلطیوں سے اسکو آگاہ کرے۔ لیکن اس میں نیت نیک رہے، تعمیری پہلو پیش نظر رہے نہ کہ تخریبی۔ کانگریس کی گزشتہ تاریخ پر سرسری نظر ڈالتے ہیں تو یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جب سے کہ گاندھی جی نے اس کی قیادت فرمائی ہے وہ رفتہ رفتہ اپنے مرکز سے دور ہوتی رہی حتی کہ اس وقت جب کہ گاندھی جی نے اس سے علحدگی اختیار کی ہے تو کانگریس بھی اپنے مسلک سے دور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان کے پیش نظر ایک خاص پروگرام تھا جس کی تقریباً تکمیل ہو چکی ہے اور اب وہ مطمین ہیں۔ یہ زمانہ کی ریت ہے کہ جب کسی شخص واحد یا جماعت میں اعلیٰ اختیارات جمع ہو جاتے ہیں تو اس کے نیک نیت رہنے پر

بُرے نتائج پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں اور اس اقتدار کا غلط استعمال ہونے لگتا ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب سے کہ گاندھی جی نے عنان کانگریس اپنے ہاتھ میں لی ہے عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے یہ قومی تحریک چند تعلیم یافتہ اشخاص کی حد تک محدود تھی۔ ملک کا بہت بڑا حصہ اس سے ناواقف اور اپنی سیاسی پستی سے بے حس تھا۔ ان کے معاشی مسلک نے قومی تحریک کیلئے تازیانہ کا کام دیا۔ ان کا یہ کارنامہ کسی طرح بھلایا نہیں جا سکتا لیکن اس بیداری پر فرقہ واریت کا رنگ چڑھانا کس حد تک قوم کے لئے بہ حیثیت مجموعی مفید ہو سکتا ہے جبکہ دعویٰ قوم پرستی کا ہو اور عمل فرقہ وارانہ۔

اس قدر تمہید کے بعد ہم مندرجہ ذیل واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ ان واقعات کے اظہار میں کسی ذاتی رائے کو دخل نہ ہوگا۔ اس کے بعد سوچیں کہ آخر یہ قابل قدر جماعت ہندوستانی مختلف فرقہ جات کو متحد کر رہی ہے یا خلیج اختلاف کو وسیع سے وسیع تر۔ رام راج قائم کرنا چاہتی ہے یا ہندو راج اور اس کے ساتھ ہی اس کو صحیح راستہ پر لانے کی تدابیر پر بھی غور کریں۔

(۱)۔ مارلے منٹو اصلاحات عمل میں آنے سے قبل ہندوستانی اقلیتوں کا تجربہ تھا کہ مخلوط انتخابات کی وجہ وہ سیاسی نقشہ سے غائب تھے۔ صرف نامزدگی کی وجہ چند اراکین کو شرکت کا موقع ملا تھا۔ اسلئے مارلے منٹو ریفارم سنہ ۱۹۰۹ء

میں جداگانہ انتخاب رکھا گیا۔ باوجود اس تلخ تجربہ کے ۱۹۱۶ء میں مسلمانوں نے فراخ دلی سے کام لیا اور میثاق لکھنؤ پر دستخط ثبت کیے جسکی رو سے بعض صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت رہنے کے باوجود ان کو اقلیت میں تبدیل کیا گیا اس اہم اقلیت کے عمل کا مقابلہ "فرقہ وارانہ فیصلہ" سے اکثریت کی ناراضگی سے کریں تو یہ پہلو واضح ہو جاتا ہے۔

(۲) بزمانہ تحریک خلافت و ترک موالات علی برادران اور گاندھی جی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو توڑنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن بنارس ہندو یونیورسٹی پہنچے تو گاندھی جی نے پنڈت مدن موہن مالویہ کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان تحریکات کے زمانہ میں بہ لحاظ تناسب آبادی مسلمان زیادہ تعداد میں جیل بھیجے گئے۔ ان نقصانات کی تلافی اسوقت تک بھی نہ ہو سکی۔

(۳) پراودہ جیل سے نکلنے کے بعد گاندھی جی نے اعلان کیا کہ میں مسلمانوں کو ایک سادہ چک دستخط کر کے دے دیتا ہوں وہ جو چاہیں حقوق اس پر تحریر کریں۔ مسلمانوں نے دہلی میں کانفرنس منعقد کی، اپنے جائز مطالبات کو پیش کیا تو جواب ملا کہ ذاتی طور پر میں اس سے متفق ہوں لیکن افسوس ہے کہ کانگریس کی مجلس عاملہ اس پر رضامند نہیں ہے۔

(۴) نہرو رپورٹ مرتب کیگئی جسمیں مسلمانوں کے بیشتر جائز مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا۔ مسلم، سکھ، دیگر پست اقوام نے بھی اس سے ناراضگی ظاہر کی۔ مسلم لیگ نے دوسری اقلیتوں کی تائید کی یا ساتھ دیا تو کانگریس نے

صرف مسلم جماعت کے اس فعل کو اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ شدید مخالفت کی بنا پر مجبوراً نہرو رپورٹ کو کالعدم قرار دیا۔

(۵)۔ بزمانۂ سیول نافرمانی بردولی والوں نے اپنی ہمت، استقلال اور ایثار کا کافی ثبوت دیا۔ مالی نقصان زیادہ برداشت کیا۔ ان پر مظالم ہونے سے کانگریس نے اس پر زور دیا کہ اسکی تحقیقات کیلئے حکومت کمیشن مقرر کرے اسی تحریک سیول نافرمانی اور عدم تشدد کے مسلک پر قائم رہ کر پشاوری پٹھانوں نے اپنی جانیں قربان کیں لیکن کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے لئے بھی کوئی کمیشن قائم ہو۔ باردولی والوں کے نقصان کی تلافی اور جائداد منضبط کی واپسی موجودہ کانگریسی وزارت صوبۂ بمبئی عمل میں لارہی ہے۔ اسی صوبۂ سرحد کو اصلاحات دلانے میں مسلم لیگ نے ان تھک کوشش کی اور کامیاب رہی مگر کانگریس کا ایک بڑا حصہ اس کو علیحدہ صوبہ تصور کرنے اور اصلاحات عطا کرنے کی محض اسلئے مخالفت کرتا رہا کہ اسکی وجہ سے وہاں اکثریت مسلم جماعت کی ہوتی ہے۔

(۶)۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں کانگریس کے سالانہ جلسہ میں یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ سے کانگریس کا نصب العین "کامل خود مختاری" ہے مگر تعجب ہے کہ نہرو رپورٹ میں مستعمراتی درجہ یعنی "ڈومینین اسٹیٹس" کو نصب العین قرار دیا "گاندھی ارون سمجھوتہ" اور دوسری گول میز کانفرنس میں بھی اسی درجہ کو ظاہر کیا گیا حالانکہ اس تبدیلی نصب العین کے متعلق کوئی تحریک دوسرے کسی کانگریس کے جلسہ میں منظور ہوئی نہ "کامل خود مختاری" کو کسی تحریک کے ذریعے منسوخ کیا گیا۔ اس قسم کے عمل میں آمرانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ

یہ رنگ گہرا ہوتا چلا۔

(۷) پست اقوام کا مسئلہ نہایت دلخراش ہے۔ انکی قسمت میں دو غلامیاں ہیں، ایک سیاسی تو دوسری سماجی۔ مذہبی اور سماجی حیثیت سے جیسے صدیوں سے "ملیچھ" ہیں ویسے اب بھی ہیں۔ انکی اس حیثیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اعلیٰ اقوام ان بے زبان اشخاص کی تعداد سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے میں سیاسی میدان میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اگر انکے لئے جان کی بازی لگائی گئی یا سماجی کمتری کو مٹانے "ہریجن" "ادھار" تحریک آغاز کیگئی تو وہ محض اسلئے کہ وہ اعلیٰ قوم سے سیاسی حیثیت سے علیٰحدہ نہ تسلیم کیئے جائیں۔ اگر واقعی اس قوم کی بھلائی مقصود ہوتی اور کوششیں نیک ہوتیں تو ڈاکٹر امبیڈکر اور ریم' سی، راجہ (مدراس) جیسے پست اقوام کے ممتاز اور قابل لیڈر مخالفت نہ کرتے اور سیاسی حیثیت سے اپنے فرقہ کو دوسری اعلیٰ اقوام سے علیٰحدہ رکھنے پر مصر نہ ہوتے۔ اب جبکہ کانگریسی وزارتیں سات صوبوں میں قائم ہوئیں تو کسی صوبہ کی وزارت میں کوئی ہریجن وزیر مقرر نہ ہوا حالانکہ اس فرقہ میں بھی قابل افراد موجود ہیں۔ حال میں سی، پی (صوبہ متوسط) کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر کھرے نے ایک وزارت ہریجن کو دینا چاہی تو اخبار "ہریجن" کے سرپرست "ہریجن اُدھار" تحریک کے بانی اور مساوات کے حامی نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اسی وسیع القلبی کی وجہ ڈاکٹر کھرے پر عتاب ہوا۔

(۸) دوسری گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستانیوں سے حل نہ ہوسکا تو اس زمانہ کے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کے سپرد کیا گیا

اور انھوں نے "فرقہ وارانہ فیصلہ" صادر کیا۔ اس فیصلہ کو مسلمانوں نے یہ کہہ کر تسلیم کیا کہ دوسرا بہتر حل پیش کریں تو اس کو ترک کرنے میں عذر نہیں ہے اس فیصلہ کی رو سے مسلمانوں کے جملہ جائز حقوق تسلیم نہیں کئے گئے ہیں باوصف اسکے محض اسوجہ سے کہ مسلمانوں کی اکثریت صوبہ جات بنگال پنجاب سندھ۔ صوبہ سرحد میں اسکی رو سے تسلیم کیگئی ہے کانگریس مخالف ہے کانگریس کا یہ رزولیوشن کہ بحالت موجودہ اسکو مسترد کیا جاتا ہے نہ منظور" قومی نقطۂ نظر سے کسی طرح مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ باوجود اس غیر جانبدارانہ پالیسی کے کانگریس کے قدیم مگر مہاسبھائی لیڈر مسٹر آسنے اور مسٹر مالویہ (سابق صدر کانگریس) سے کانگرس سے علٰحدگی اختیار کی اور اپنی ایک علٰحدہ جماعت قائم کی ہے جسکی قیادت مرکزی اسمبلی (دہلی) میں مسٹر آسنے فرمارہے ہیں۔ اسی مسئلہ پر اور اس زمانہ سے کانگرس اپنے میں مہاسبھائی اسپرٹ ضم کرنے لگی۔

(۹) قانون ہند ۱۹۳۵ء کی ابتداء میں شدت سے مخالفت کی۔ بعد میں انتخابات میں حصہ لیا۔ سات صوبوں میں کانگریس کی اکثریت رہی۔ عرصہ تک عہدے قبول کرنے نہ کرنے کا مسئلہ معرض بحث میں رہا۔ بالآخر اس مسلک کے ساتھ کہ "اصلاحات توڑیں گے" وزارتیں قبول کیں۔ وزارت عظمیٰ کے انتخاب میں بمبئی کے مشہور پارسی کانگرسی لیڈر مسٹر نریمن کے ایثار و قابل قدر خدمات و قابلیت کو نظر انداز کیا گیا اور انکے حق میں صریحاً ناانصافی کیگئی۔ مسٹر نریمن اور گاندھی جی میں بعض سیاسی امور کے سلسلہ میں مراسلت ہوئی۔ خفیہ دریافت ہوئی۔ اس رپورٹ کو خانگی بیان کرنیکے باوجود کلکتہ میں گاندھی جی نے

کانگریس کی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کیا اور مسٹر زمین کو لاعلم رکھا اور بغیر کسی جوابدہی وصفائی کے کانگریس اعلیٰ کمان نے انہیں ذمہ دارانہ خدمات کانگریس کے لئے نااہل قرار دیا۔ ہر سمجھدار ہندوستانی مسٹر زمین سے انکی اس بیقدری میں ہمدردی رکھتا ہے۔ اسی وزارتی سلسلہ میں بعض مسلم لیگ کے ارکان کو ہموار کر لیکر معمولی وزارتیں بعض صوبوں میں دی ہیں تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو کہ کانگریس میں مسلمان بھی شریک ہیں اور یہ کہ کانگریس کی یہ تحریک کہ عام مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانگریس میں شریک ہونیکی ترغیب دیں، اس کو تقویت ہو نیز یہ کہ مسلم لیگ میں اس تحریک سے کمزوری پیدا کی جائے۔

(۱۰) ڈاکٹر کھرے سابق وزیر اعظم صوبہ متوسط کا بیان ہے کہ انھوں نے "وزرائے اعظم کی کانفرنس" منعقدہ بمبئی میں اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ کانگریس کا مسلک رفارم (اصلاحات) کو توڑنا ہے نہ کہ اس کو قابل عمل بنانا اس لئے ہماری توجہ اپنے مسلک کی طرف منعطف کی جائے۔ کانگریس کے صدر اور دیگر ممتاز اراکین پالیمنٹری بورڈ شریک تھے لیکن کسی نے توجہ نہ کی ان کا یہ بھی خیال تھا کہ "۲۶ ر جنوری" کو ہر سال یوم خود مختاری قرار دیکر تعطیل عام دی جائے۔ مگر انہیں یہ جواب ملا کہ "خواہ مخواہ رکاوٹیں مت پیدا کرو"۔

(۱۱) ڈاکٹر خان وزیر اعظم صوبہ سرحد اور مسٹر شریف سابق وزیر صوبہ متوسط نے اختیارات خصوصی کے تحت دیگر ہندو..... قیدیوں کے ساتھ دو مسلمانوں کو بھی معافی عطا فرمائی اس پر مسٹر شریف کے خلاف آریہ سماجی اور مہا سبھائی جماعتوں نے احتجاج کیا اور پروپگنڈا کرنا شروع کر دیا۔ کانگریس نے متذکرہ بالا

جماعتوں کے اثرات کے تحت مسٹر شریف کو بعد تحقیقات (اگرچہ تحقیقات میں کوئی ناانصافی مسٹر شریف سے نہ ہونا تسلیم کیا گیا اور وزیر اعظم ڈاکٹر کھرے نے مسٹر شریف کی تائید بھی کی) بلاوجہ مستعفی ہونے پر مجبور کیا اور وہ مستعفی ہوئے مسٹر شریف نے مسلم لیگ ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا تھا بعد کانگریس میں بوجہ وزارت شرکت کی تھی۔ برخلاف اسکے ڈاکٹر خان کے خلاف کوئی سخت کارروائی کانگریس نے اختیار نہیں کی حالانکہ دونوں کے حالات ایک ہی تھے تحقیقات پر زور دیا نہ مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ محض اسلیئے کہ ڈاکٹر خان کی پشت پر برادرانِ ہندوستان کی کثیر جماعت ہے۔ کانگریس کی موجودہ پالیسی سے ڈاکٹر خان نے کسی قدر اختلاف بھی کیا ہے لیکن اعلیٰ کمان خاموش ہے۔

(۱۲)۔ وزارت صوبہ متوسط کے متعلق کانگریس کی مجلس عاملہ کی یہ رائے رہی کہ وہ فرقہ پرستی اور طرف داری میں مبتلا ہے باوجود اس کے اس کو مستعفی ہونے پر مجبور نہ کیا بلکہ صرف ہدایت پر اکتفا کی۔ ڈاکٹر کھرے کے استعفے کی داستان سبق آموز ہے کانگریس نے ڈاکٹر کھرے کے حق میں سخت ناانصافی کی ہے۔ ہندوستان کے اکثر لیڈران سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان سے کوئی آئینی غلطی نہیں ہوئی۔ کانگریس کی یہ خواہش تھی کہ مسٹر شکلا وزیر اعظم ہوں۔ بالآخر اس سازش کے مسٹر کھرے شکار ہوئے۔ ڈاکٹر کھرے کے تفصیلی بیان سے ممتاز اور قوم کے رہنما لیڈروں کی ذہنیت اور پالیسی کا پتہ چلتا ہے۔ غرضکہ اعلیٰ کمان کی استبدادیت کے مسٹر نریمان شکار نمبر (۱) ہیں تو ڈاکٹر کھرے نمبر (۲)۔

(۱۴۳)۔ وزارت صوبہ متوسط کے ارکین مہا سبھا اور آریہ سماج جماعتوں کے سرگرم کارکن اور لیڈر رہیں۔ سابق وزیر مسٹر دیسکھ نے گول میز کانفرنس میں مہا سبھائی جماعت کی قیادت کی تھی۔ مسٹر گپتا موجودہ اسپیکر اسمبلی آریہ سماج کے لیڈر اور اسکے کام میں علانیہ حصہ لیتے ہیں حالانکہ اسپیکر کا تعلق کسی پارٹی سے نہیں ہونا چاہیئے۔ مسٹر ساورکر صدر مہا سبھا کی تقریر ناگپور میں ہوتی ہے تو وزراء خاص طور پر اسمیں حصہ لیتے اور دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ صوبہ متوسط میں اس وزارت نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم کیا ہے اور کر رہے ہیں وہ ناقابل بیان ہے۔ قلمدان وزارت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ جبل پور کے مسلمانوں کو جن ہندوؤں نے قتل کیا تھا اور جن کا مقدمہ زیر تحقیقات تھا اس کو اٹھا لیا۔ احتجاج کا کوئی لحاظ نہ ہوا۔ مہا سبھائی اور آریہ سماجی اسپرٹ کا مظاہرہ اس صوبہ میں اپنے انتہائی درجے پر ہے۔ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ یہاں کی وزارت میں صرف ایک مسلمان تھا اس کو بھی مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ اپنی جماعت سے بیوفائی کرنے کا انھیں صلہ ملا۔

(۱۴۴)۔ مسٹر شکلا وزیر اعظم وقت نے بزمانہ کھرے وزارت "ایک تعلیمی تجویز پیش کی جو "ودیا مندر اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اس اسکیم کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب نے مضامین شائع کئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کی وزارت کی یہ نیت ہے کہ ہندو کلچر غالب رہے اور مسلمانوں کا تمدن، تہذیب، زبان فنا ہو جائے۔ مسلمانوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے صرف ایک اردو مدرسہ فوقانیہ تھا وہ بھی حال میں برخاست کر دیا گیا ہے۔ ہندی

کی تعلیم بہ جبر ہو رہی ہے۔ اسکی ترویج کیلئے لاکھوں روپیہ صرف کیا جا رہا ہے۔ اسکی تفصیلات بہت ہیں۔ مختصر یہ کہ کانگریس بھی صوبہ متوسط کی وزارت کی تعلیمی رپورٹ کی توثیق اور انکی اسکیم کی تعریف کرتی ہے۔ مسلمانوں کی چیخ پکار اور احتجاج کا کانگریس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہاں کی وزارت کی کانگریس حوصلہ افزائی کرتی نظر آتی ہے۔

(۱۵) ہندی اردو کا تنازعہ عرصہ سے چلا آرہا ہے۔ طے پایا کہ ہندوستانی قومی زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ رسم الخط اردو اور ناگری دونوں رکھا ہے۔ رسم الخط کی حد تک یہ کہ گزشتہ ہری پور کانگریس میں جتنی تختیاں آویزاں تھیں ان میں ہندی لکھی گئی تھی اور اس کا رسم الخط ظاہر ہے ناگری تھا۔ زبان ہندی کو سنسکرت الفاظ سے نہایت ادق بنایا جا رہا ہے۔ الفاظ کا استعمال بے جوڑ اور بھدا ہوتا ہے جس سے ہندی زبان کی شیرینی غائب ہو جاتی ہے کانگریسی وزارتوں کی رپورٹیں ناگری خط میں شائع ہوتی ہیں۔ اردو زبان میں بھی شائع کرنے کیلئے کہا جاتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ اس میں مصارف زیادہ ہوتے ہیں۔ صوبہ جات کی کونسل اور اسمبلی (کانگریسی) میں تقاریر ہندی میں ہوتی ہیں تو خواہ مخواہ سنسکرت الفاظ بے محل استعمال کئے جاتے ہیں۔ بہ قول مولانا نیاز فتح پوری "اگر مولانا ابوالکلام آزاد صوبہ متحدہ کی اسمبلی میں کانگریسی وزراء و اراکین کی تقریریں سنیں تو بے اختیار خود بھی فارسی یا عربی میں تقریر کرنے کھڑے ہو جائیں گے"۔ ہندی کی مخالفت نہ صرف مسلم جماعت کر رہی ہے بلکہ دیگر فرقہ جات بھی۔ باوجود شدید احتجاج کرنے اور صوبہ مدراس میں اس زبان کے

مخالفین کے چوکسی کرنے اور سزا بھگتنے کے کانگریس سختی سے اس پر قائم ہے۔
اس کا خیال ہے کہ زبان کے ذریعے ہندو کلچر قائم اور پھیلایا جا سکتا ہے۔
دوسرے فرقوں کو نقصان پہنچانے کا یہ ایک اہم حربہ ہے۔

(۱۶) "بندے ماترم" کو قومی ترانہ تسلیم کرنا اس بات کا شاہد ہے کہ کانگریس ہندو راج قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ کانگریسی صوبہ جات کے مدارس، کونسل، اسمبلی، اور ہر جلسہ، سماجی، معاشری، سیاسی کی ابتدا اس ترانہ سے کی جاتی ہے حتیٰ کہ صوبہ بمبئی کی وزارت اس بات کی کوشاں ہے کہ روزانہ ریڈیو پروگرام شروع ہونے سے قبل "بندے ماترم" ترانہ گایا جائے۔ کونسل اور اسمبلی کا اجلاس اس ترانہ سے شروع ہونے کے بعد تقاریر جدید ہندی میں کی جاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ مجالس وضع قوانین نہیں بلکہ مجالس مذہبی ہیں۔ اس ترانہ کی مسلمانوں نے سختی سے مخالفت کی ہے۔
اس ترانہ کی ایک تاریخ ہے۔ بنگالی ناول نویس "بنکم چندر چٹرجی" نے اپنی مشہور ناول "آنند متھ" میں یہ ترانہ لکھا ہے۔ اس ناول کے ہیرو "بھوانند" کی یہ کوشش رہتی ہے کہ بنگال سے مسلمان نکل جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک یہ نہ نکل جائیں ہندو دھرم، کلچر، عزت خطرہ میں رہے گی۔ غرض کہ اس کتاب میں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو برانگیختہ کیا گیا ہے اور کھلے الفاظ میں مخالفت کی گئی ہے۔ اسی ناول کا ہیرو بھوانند "درگا دیوی" کے سامنے یہ ترانہ گاتا ہے تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ کیا ایسے فرقہ وارانہ اور ایسی ذہنیت کے تحت لکھا ہوا ترانہ ہند کا "قومی ترانہ" کہلایا جا سکتا ہے۔

کیا اسکے گانے سے مادر وطن کی عظمت اور آپسمیں محبت پیدا ہو سکتی ہے۔ کیا اب ہندوستان میں شعراء باقی نہ رہے جو موزوں قومی ترانہ لکھ سکیں۔ یہ محض کانگریس کی ہٹ دھرمی، تنگ نظری، فرقہ پرستی ہے کہ وہ اس کو قائم رکھنے پر مُصر ہے۔

(۱۷) ستیاگرہ، عدم تشدد، ترک موالات، سول نافرمانی کی تحریکات اور اصُول پر گاندھی جی عامل رہے اور کانگریس نے بھی ان اصول کو تسلیم کیا۔ عدم تشدد کے اصول پر فلسفیانہ مقالے لکھے گئے اور لکھے جارہے ہیں۔ انگریزی حکومت نے تشدد سے کام لیکر کانگریسی سیاسی تحریکات کو کمزور کرنیکی کوشش کی تو اس پر اعتراض کیا گیا۔ جابر اور ظالم حکمرانوں سے تشبیہہ دی گئی لیکن آج ہم صوبہ مدراس میں دیکھتے ہیں کہ کانگریسی وزیر اعظم گاندھی جی کے خاص چیلے مسٹر سی راجگوپالا چاری تشدد کی پالیسی پر قائم اور سختی سے اس پر عامل ہیں۔ سیاسی نہیں بلکہ ادبی تحریک "ہندی کے خلاف مظاہرہ اور جو کسی کرنیوالوں کو" سزائیں دی جارہی ہیں۔ اسی غرض سے قانون ترمیم فوجداری ہند نافذ کیا گیا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ گاندھی جی اس پالیسی کی تائید اور مسٹر راجگوپالا چاری کے عمل کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ گاندھی جی کا یہ استبداد بآسانی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ عام طور پر کانگریسی وزارتیں تشدد کی حامی ہیں۔ وزارت بمبئی نے ہڑتال کرنیوالوں کو سزائیں دیں۔ "یوم قیدیاں شولاپور" میں حصہ لینے والوں کو بھی اس کانگریسی وزارت نے سزا دی ہے حالانکہ اس سے پہلے کی وزارت نے ایسا عمل اس خصوص میں نہیں کیا تھا۔ شولاپور کے

دو قیدیوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے جس کو ۱۴ یوم کا عرصہ ہوتا ہے لیکن اسوقت تک انکی تائید میں کوئی کارروائی اور نہ عدم تشدد کے اصول کے بانی نے لب کشائی یا خامہ فرسائی فرمائی وزارت صوبہ سرحد نے کانگرس کی ہی ایک جماعت .... "اشتراکی کانگرس پارٹی" کے چند اراکین کو اشتراکی اصول کی تلقین کی وجہ گرفتار کیا اور سزا دی۔ جب اس جماعت کو کانگرس میں شریک کر لیا گیا ہے تو اس کانگرسی وزارت کا عمل اصول کانگرس کے خلاف رہا۔ باوجود اس اعلان کے "جو وزارت کانگرس کے اصول اور شرائط پر قائم اور پابند نہ رہے گی اس کو برخاست کیا جائے گا" اس کی اصول شکنی ہو رہی ہے تو وہ نہ صرف خاموش ہے بلکہ ان وزارتوں کی اور حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ کانگریس اپنے اصول پر قائم رہتی تو صوبہ متوسط بمبئی، صوبہ سرحد اور مدراس کی وزارتیں کبھی کے برخاست ہو جاتیں۔

ہری پور کانگریس میں یہ رزولیوشن منظور کیا جاتا ہے کہ "کانگرس دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل نہ دیگی گویا اسکی پالیسی" عدم مداخلت" کی رہیگی۔ اور دیسی ریاستوں میں کانگرس کی شاخیں قائم نہ رہیں اور نہ دیسی کے باشندے اپنی انجمنوں کو "کانگرس" کے نام سے موسوم کریں جس سے غلط فہمی پیدا ہونیکا قوی احتمال ہے باوجود اس صاف و صریح رزولیوشن کے بعض دیسی ریاستوں کے باشندوں نے اپنی سیاسی انجمنوں کا نام "کانگریس" رکھا۔ ان کے خلاف قانون عمل پر حکومت نے سخت سزائیں دیں تو کانگرس نے مداخلت کی۔ ہمدردی ظاہر کی۔ نمائندے بھجوائے تحقیقات کے لئے

کمیشن کا تقرر کروایا اور دوسروں کو تقرر کمیشن پر زور دیا۔ حکومت کے عمل پر ناراضگی ظاہر کیگئی۔ اپنے دائرہ عمل سے ہٹ کر باہر آئینی اور صریح پالیسی کے خلاف عمل کرنیکی ضرورت ہی کیا تھی۔ پہلے خود اپنا عمل درست کرلیں اس کے بعد دوسروں کو اسکی تلقین کریں۔ جو خود گمراہ ہو وہ دوسروں کی کیا رہبری کرسکتا ہے۔ اصول سے ہٹ کر اس قدر عمل ہو رہا ہے کہ اب قوت تمیز بھی باقی نہیں رہی اور اپنے ہر فعل کو بہتر، مفید اور قومی سمجھا جارہا ہے حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔

(۱۹) کانگرس نے یہ صاف طور پر اعلان کیا ہے کہ وفاق کو جیسا کہ اس وقت ہے قبول نہیں کیا جائیگا۔ مسٹر دیسائی اور دیگر ذمہ دار لیڈر انگلستان میں اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ چند تبدیلیوں کے ساتھ وفاق قبول کیا جائیگا۔ مسٹر ستیا مورتی نے بھی اس قسم کا خیال ظاہر فرمایا تو کانگرس کے موجودہ صدر مسٹر سوباش چندر ابوس اس خیال کی مخالفت کرتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ وفاق کی مخالفت کریں گے اگر کانگرس اس کو قبول کرلے گی تو وہ کانگرس سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ اس تمام عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کاغذ پر رزولیوشن کچھ ہے تو بعض لیڈر کے دلوں میں کچھ۔ ایک دوسرے میں تطابق اور کوئی معین پالیسی اس مسئلہ پر نہیں ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ ہوا کا رخ دیکھکر کام کریں گے۔

(۲۰) کانگرسی صوبہ جات میں اقلیتیں ناخوش ہیں حتیٰ کہ صحیح معنی میں جو قوم پرست ہیں وہ بھی ان کے عمل سے ناخوش ہیں۔ بنگال کے وزیر اعظم

مسٹر حق نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ صرف کانگرسی صوبہ جات میں فرقہ وارانہ شدید فسادات ہوئے دوسرے صوبہ جات اس سے محفوظ ہیں اس لئے کہ ان صوبہ جات میں اقلیتیں خوش اور مطمئن ہیں۔" غیر کانگرسی صوبہ جات میں کانگرسی لیڈر نے مختلف طریق پر جدوجہد جاری رکھی ہے کہ کسی طرح وہاں بھی کانگرسی وزارتیں قائم ہوں۔ اس سے منشا یہ ہے کہ مسلم اکثریت برسر اقتدار نہ رہنے پائے۔ کانگرسی صوبہ جات میں بالخصوص مسلم قوم غیر مطمئن ہے اسکے ساتھ سخت ناانصافی کی جارہی ہے۔ اس کے کلچر مذہبی تعلیم، تہذیب اور زبان کو مٹانے کی طرف یہ مائل ہے۔ گاندھی جی اور کانگرس نے مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہا کہ کسی طرح ہندو مسلم اتحاد ہو۔ لیکن یہ گفت وشنید ناکام رہی۔ مسلم لیگ نے یہ دعوی کیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے اور کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے۔ کانگرس نے جواب دیا کہ وہ ایک قومی جماعت ہے اور فرقہ واریت سے بالاتر ہے۔ اور مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے بلکہ اور جماعتیں بھی موجود ہیں۔ اس تمہید میں ہی دونوں جماعتوں کا اتحاد نہ ہوسکا۔ اب رہا لیگ کا یہ چیلنج کہ کانگرس فی الحقیقت ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے اور قومیت سے کوسوں دور۔ وہ اپنی جگہ قائم ہے اس کا تشفی بخش جواب نہ ملا۔ اور لیگ کا یہ جواب کہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ کو واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا گیا تھا اور آج جب کہ وہ بہتر طریق پر منظم ہے اسکی حیثیت سے انکار کرنا قابل غور ہے" ناقابل تردید ہے۔

(۲۶) کانگرسی وزارتوں کے عمل اور مراسلت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ان صوبہ جات میں جسم کے جوارح ہیں تو ان کا دماغ شیوگاؤں میں ہے۔ کوئی اہم کام بلا گاندھی جی کے مشورہ کے نہیں کیا جاتا۔ اگرچہ خود کو کانگرس سے علیحدہ کر چکے ہیں لیکن کانگرس پر وہ حاوی اور اس کے آمر ہیں دیگر لیڈر اور کانگرسی وزرار سے خود اعتمادی سلب ہو گئی ہے معلوم ہوتا ہے۔ وزارتیں پارلیمنٹری بورڈ اور کانگرس کی مجلس عاملہ یہ تمام ان کے اشاروں پر کام کر رہے ہیں وہ حربے جو برطانوی حکومت نے کانگرس کے خلاف استعمال کئے تھے اور جن کو گاندھی جی نے کبھی ناپسند کیا تھا انہی کے استعمال کی تلقین کانگریسی صوبہ جات کی وزارت میں کی جا رہی ہے۔ ہر چند وزیر صوبۂ متوسط میں لئے جانیکی غرض سے ہریجنوں نے گاندھی آشرم کے سامنے جو کسی اور مظاہرہ شروع کیا ہے تو جواب ملتا ہے کہ یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے وہ اپنی رائے پر اس وقت تک قائم ہیں اور رہیں گے۔

مندرجہ بالا تمام واقعات سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ کانگرس حصول آزادی کی خواہاں نہیں ہے بلکہ اس کی خواہش ہے کہ برطانوی حکومت کے زیر سایہ ہندو راج کے لئے رفتہ رفتہ میدان صاف کیا جائے۔ اب بھی ایسے لیڈر موجود ہیں جو کانگرس کے موجودہ عمل کے مخالف ہیں۔ لیکن گاندھی جی کے مقابلہ میں کسی دوسرے کا اتنا اثر نہیں کہ وہ کانگرس کو صحیح راستہ پر لائیں۔ وہ آزادی حاصل کرنیکے لئے بے چین اور موقع کے منتظر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کانگرس دیگر فرقہ وارانہ انجمنوں سے علیحدہ اور بالاتر رہے اور کانگرسی اراکین

بجز قومی تحریک کے کسی اور فرقہ وارانہ انجمن میں حصہ نہ لیں اگر ایسا ہے تو انہیں کانگرس کی رکنیت سے علیحدہ کیا جائے فی زمانہ کانگرس صرف اراکین کی تعداد میں اضافہ چاہتی ہے نہ یہ کہ اس کے کارکنوں میں خلوص پیدا ہو۔ اگر فرقہ وارانہ انجمنیں اس خیال سے کہ ہر فرقہ اپنی تنظیم بہتر طریقہ پر کرلے اور مقصد حصول آزادی ہو تو قوم بہ حیثیت مجموعی ترقی کرے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کانگریس اور دیگر انجمنوں کو صحیح راہ عمل پر لگایا جائے جس سے آزادی کی منزل قریب تر ہو۔ ورنہ ہندوستان اسی طرح گمراہ اور بھٹکتا رہے گا۔

ہندوستانی دستوری ارتقاء

ایشیائی فطرتاً شاہ پرست ہوتے ہیں اور بادشاہ کو ظل اللہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کی پچھلی تاریخ اور مختلف مذاہب کی تعلیم پر نظر ڈالنے سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ یہ تخیل کی حد تک نہ رہا بلکہ اس پر عمل بھی رہا ہے اور اس وقت بھی ہے لیکن ایسے حالات کا پیدا ہونا جن سے لوگوں کے دلوں میں جمہوریت کا خیال پیدا ہوا قابل غور ہے۔ جمہوریت پسندی سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ شاہ پرستی کے منافی ہے۔ ان دونوں سیاسی تصورات کا اجتماع بعض متمدن ممالک میں بہتر صورت میں نظر آتا ہے۔
اسوقت ہمارے پیش نظر یہ مسئلہ ہے کہ ہم ان حالات کا مطالعہ کریں جن میں

برطانوی ہند جمہوریت کی طرف مائل ہوا۔ اور اس خصوص میں اس نے کس طرح بتدریج ترقی کی ہے۔ وہ دن دور نہیں جبکہ برطانوی ہند میں جمہوری حکومت قائم ہوگی۔

سب سے پہلے اس تخیل کا وجود مشرقی اور مغربی تمدن کے اتصال کا نتیجہ ہے جہاں مغرب نے دیگر شعبہ جات زندگی پر اپنا اثر جمایا وہاں مشرقی سیاسیات پر بھی ضرور اثر انداز ہوا۔ ترقی سائنس نے دنیا کو ایک خاندان بنا دیا ہے۔ زمان و مکان کے تحدیدات ناقابل قیاس طریق پر رفع ہوئے۔ ایک ملک دوسرے ملک کے حالات سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ مغربی تعلیم و تمدن نیز حکومت برطانیہ کی نوعیت کو اسمیں بڑا دخل ہے۔ یہ ممکن تھا کہ انگریز مُدبرین ہندوستان کو بجائے جمہوریت کے ملوکیت کیطرف ہی لیجاتے مگر برطانوی، اپنی خصوصیات ذہنی اور اپنے سیاسی مسلک اور ہندوستان کے حالات سے مجبور تھے کہ یہاں جمہوری طرز کی حکومت قائم کرتے۔ انگریزوں نے اپنے ملک میں انفرادی آزادی کیلئے جو سعی کی ہے وہ دوسرے ممالک کیلئے ایک نمونہ ہے۔ چھ سو سال کی پیہم کوششوں کے بعد انھیں یہ آزادی حاصل ہوئی۔ ان کا سیاسی ادارہ اور دستور دیگر ممالک کے لئے ایک نمونہ اور ان کی پارلیمان مادر پارلیمان کہلاتی ہے اس تصور سے ہٹ کر دوسرا سیاسی تصور ان کے ذہن میں بہ مشکل آسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ سات ہزار میل کے فاصلہ پر سے ایک وسیع ملک پر جہاں کی زبان و معاشرت مختلف ہو، حکومت کرنا دشوار تھا جبتک کہ ملکیوں ہندوستانیوں، کو نظم و نسق میں ہاتھ بٹانے کا موقع

نہ دیتے تیسرے یہ کہ خود انکی تعلیم نے جدید تخیلات و تصورات، نظریات کو پیش کیا ہے جس کے مغائر عمل کرنا گویا اپنے اصول کو آپ توڑنا تھا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ پر غور کرتے ہیں تو یہ پہلو واضح ہوتا ہے کہ اس پر ہمیشہ دوسری اقوام کی نظریں رہیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئیں۔ مغربی اقوام سے قبل جو قومیں آئیں وہ ملک گیری کے خیال سے آئیں اور انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا اور حکومت کی، بخلاف اسکے مغربی اقوام ملک گیری یا وطن بنانے کے خیال سے نہیں بلکہ تجارت کی غرض سے آئیں۔ ان کے پیش نظر کوئی سیاسی لائحہ عمل نہ تھا۔ برطانوی کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی) سے قبل ہندوستان میں پرتگالی، فرانسیسی، ڈچ، تجارتی کمپنیاں موجود تھیں۔ ان کمپنیوں میں آپسمیں تجارتی مسابقت جاری رہی اور ایک دوسرے کی کاٹ میں رہے۔ کچھ عرصہ بعد ہندوستان کی سیاسی حالت ابتر ہو چلی۔ مرکزی حکومت میں انحطاط شروع ہوا۔ جس سے مختلف صوبہ جات خود مختار بنتے ہوگئے طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ آپسمیں جنگ ہونے لگی۔ ان اندرونی حالات سے کمپنیوں نے فائدہ اٹھانا شروع کیا "عدم مداخلت" کی پالیسی کو ترک کیا اور یہاں کی سیاسیات میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ بیرونی کمپنیوں میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو زیادہ کامیابی ہوئی۔ دیگر کمپنیوں کو زک ہوئی اور وہ مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس کمپنی کی یہ کوشش رہی کہ اسکو نہ صرف تجارتی اجارہ حاصل رہے بلکہ اسکے تحت ہندوستان کا کچھ حصہ ملک بھی رہے جہاں وہ اپنے قواعد نافذ کر سکے۔ ابتدائی دور یہ رہا کہ اس حصہ میں اپنے ہم وطن اپنے ملکی قوانین کے

تابع رہیں۔ دوسرا دور وہ رہا جبکہ اس حصہ کے ملکیوں پر بھی اپنے ملکی قوانین کی تعمیل لازمی گردانی۔ ابتدا میں سلطنت مغلیہ سے اس قسم کا اختیار انھیں عطا کیا گیا تھا لیکن بعد میں اس اختیار کا تعلق راست انگلستان کی پارلیمنٹ سے اس نے رکھا۔ یہاں کی بدامنی اور کمزوری کے تحت کمپنی نے اپنے صوبے قائم کئے۔ گورنران پر حکومت کرتے اور ان کا صدر گورنر جنرل ہوتا تھا کمپنی کا پہلا گورنر جنرل وارین ہیسٹنگز تھا گورنر اور گورنر جنرل کی کونسل ہوتی۔ کمپنی نے اپنا دستور مرتب کر لیا۔ سلطنت مغلیہ کے تحت وہ نہ رہی۔ اس کونسل کے قیام کے بعد عاملانہ حکومت کا جو اختیار وضع قوانین کا تھا وہ رک گیا۔ بمبئی، مدراس اور کلکتہ تین صوبہ جات ابتدا میں تھے۔ صوبہ بمبئی اور مدراس کے گورنروں کے اختیارات قوانین سازی کو سلب کیا گیا۔ یہ صرف گورنر جنرل کے پاس سفارش کریں اور گورنر جنرل اپنی کونسل میں انھیں پیش کرنے کے بعد قوانین وضع اور نافذ کرتا تھا۔ عاملانہ شعبہ علحدہ قائم کیا گیا۔ مشیر قانونی کا ایک مستقل عہدہ مرکزی کونسل میں قائم ہوا۔ پہلا مشیر قانونی "لارڈ مکالے" ہے سہولت کار کیلئے ان کونسلوں میں ملکی عنصر میں بتدریج اضافہ کیا گیا۔ قیام کونسل کے بعد ابتدائی دور میں "مرکزیت" پر زور دیا گیا۔ صوبہ واری کونسلوں کے اختیارات میں تخفیف ہوئی۔ البتہ اس کے کچھ عرصہ بعد مرکزیت کے خیال میں تبدیلی اور اسکے اقتدار میں کمی ہوئی۔

اس سلسلہ میں اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مسٹر پٹ کے مسودۂ ہند ۱۷۸۴ء کی وجہ سے بورڈ آف کنٹرول قائم کیا گیا جس کا ایک صدر اور چھ اراکین ہوتے تھے اور صدر رکن کابینہ انگلستان بھی ہوتا تھا۔ یہ بورڈ توسط ثابت ہوا

حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے مابین۔ ان، اسکی رو سے گورنر جنرل کے اختیارات پر نگرانی کی جاتی تھی۔ حکومت ہند کی کونسلوں میں جو اختیارات قوانین وضع کرنیکے متعلق استعمال کئے جاتے تھے وہ پارلیمنٹ برطانیہ کی جانب سے عطا کئے گئے تھے۔ اصولاً یہ ایسے قوانین نافذ نہیں کر سکتے جو امپیریل حکومت کے مفاد کے منافی ہو اور یہ اختیارات صرف ذیلی ہیں۔

سنہ ۱۸۳۳ء اور سنہ ۱۸۵۳ء میں دستوری تبدیلیاں عمل میں آئیں پہلے ایکٹ سنہ ۱۸۳۳ء کی رو سے مستقل مشیر قانونی مقرر ہوا۔ سنہ ۱۸۵۳ء کے ایکٹ کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل قانون سازی کی حد تک واحد قوت رہی۔ صوبہ داری حکومتیں صرف سفارش کر سکتی تھیں۔ پہلی مرتبہ اس ایکٹ کی رو سے مقامی نمایندگی عمل میں آئی تاکہ مقامی حالات کا علم ہو اور اس سے قانون سازی میں مدد حاصل ہو۔ مسودات کی جانچ سلکٹ کمیٹی کے سپرد کیجاتی تھی نہ کہ تنہا رکن قانونی سے یہ کام لیا جاتا تھا اور گورنر جنرل کی کونسل میں مزید (٦) اراکین کا اضافہ کیا گیا۔ دو سپریم کورٹ کے جج اور چار اراکین سرکاری بمبئی، مدراس، بنگال و آگرہ سے تھے۔ کونسل میں تقاریر ہوتیں نہ کہ تحریر پڑھی جاتی اور پہلی مرتبہ قانون سازی اس ایکٹ کی رو سے پبلک میں لائی گئی۔ یہ لارڈ ڈلہوزی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ....

قانون سازی نہ صرف حکومت کا خاص فریضہ (وظیفہ) ہے بلکہ خاص مشنری اور پابند ضابطہ۔ یہ ہندوستانی پارلیمان حکومت عاملانہ کو دق کرنے لگی۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ صوبہ جات میں عاملانہ جماعت قانون سازی کرے۔ وہ چاہتی تھی کہ عاملانہ جماعت مقننہ کے تابع رہے۔ اس کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ اس کو

حکومت ہند و وزیر ہند (صدر بورڈ) کی بعض مراسلت سے بھی آگاہ کرے غرض کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک کمپنی کے پیش نظر ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود زیادہ تھی۔ عام تجربات دستوری ارتقاء کے لئے کئے جارہے تھے۔ اس عرصہ میں لارڈ بنٹنگ، ڈلہوزی جیسے مدبر اور ہمدرد گورنر جنرل کمپنی نے بغرض اصلاح بھجوائے تھے۔ لیکن انقلاب کے بعد سے وہ احتیاط سے قدم رکھنے لگے۔ کمپنی سے تاج برطانیہ پر اختیارات منتقل اور حکومت ہند براہ راست حکومت برطانیہ کے تحت رہی۔ درمیان میں کمپنی کا توسط نہ رہا۔ بورڈ آف کنٹرول برخاست کردیا گیا۔ البتہ صدر بورڈ وزیر ہند تسلیم کیا گیا۔ اس کے لئے ایک کونسل آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا جس میں اٹھارہ اراکین ہوتے ہیں جو اس کو مدد دیں یہ کارروائی راز میں کریں وزیر کو اختیار کامل ہے کہ وہ سفارشات کونسل کو تسلیم یا مسترد کرے۔ البتہ یہ وزیر جو رکن کابینہ ہوتا ہے پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔

انقلاب کے بعد سے مزید تبدیلی یہ ہوئی کہ ابتک ہندوستانیوں کی رائے سے جو غفلت برتی جاتی تھی وہ نہ رہی اور یہ کہ ہندوستانی مسائل سے پارلیمنٹ دلچسپی اسوقت تک نہیں لیا کرتی تھی لیکن وہ بھی دلچسپی لینے لگی۔ ملکہ وکٹوریہ نے مذہبی آزادی اور تحفظ تمدن کا اطمینان دلایا اور اعلان کیا۔ اسکی رو سے کمپنی کے فرائض و حقوق کو تاج برطانیہ نے تسلیم کیا۔ دیسی ریاستوں سے جو تہد نامہ جات عمل میں آئے تھے انھیں تسلیم کیا۔ معافی عامہ دیگئی اور لارڈ کیاننگ ہندوستان کے پہلے وائسرائے مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں لارڈ کیاننگ کی درخواست پر

مسٹر جیمس ولسن پہلے رکن مالیات مقرر کئے گئے۔ ۱۸۶۱ء میں "قانون ہندوستانی کونسل" نافذ ہوا۔ اسکی رو سے کوئی اہم تبدیلیاں سابقہ دو قوانین ۱۸۳۳ء و ۱۸۵۳ء میں نہ ہوئیں اور نہ یہ اس قدر اہم ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے مدراس وبمبئی کی کونسل قائم رہی لیکن اب بھی صوبہ جاتی قانون سازی گورنر جنرل کی محتاج منظوری تھی اور گورنر جنرل کی کونسل تمام ہندوستان کیلئے قوانین وضع کرنیکی مجاز تھی۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کی وجہ سے احتیاطاً ہندوستانی رائے معلوم کرنیکے لئے صوبجاتی اور مرکزی کونسل میں ہندوستانی نمایندے لئے گئے بذریعہ رائے دہی نہیں بلکہ بذریعہ نامزدگی انکا انتخاب ہوا کرتا تھا لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں جو پارلیمانی طرز کونسل کا تھا وہ سختی سے روک دیا گیا۔ ان جدید جماعتوں کا کام صرف قانون سازی تھا کسی اور امر میں وہ دخل نہیں دے سکتے تھے۔ طریق انتخاب رائج نہیں کیا گیا۔ ملک میں نمایندگی کے ادارے قائم نہ تھے اس لئے حکومت عاملانہ ومقننہ ہند کے اختیارات رعایا سے حاصل نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ پارلیمنٹ سے علحدہ کئے گئے تھے۔ جو ہندوستانی شریک کونسل تھے وہ بنظر سہولتِ نظم ونسق لئے گئے تھے۔

ان نمایندگان کی آواز میں کوئی وزن نہ تھا۔ حکومت صرف انکی رائے معلوم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن تسلیم کرنے پر مجبور نہ تھی۔ یہ دستور ۱۸۹۱ء تک قائم رہا۔ اس عرصہ میں مقامی قانون سازی کے تجربات بزمانہ لارڈ رپن اور لارڈ ڈفرن آزادی سے کئے گئے باوجود اسکے کوئی ذمہ دارانہ عنصر ہندوستانی اراکین کا ان کونسل میں نہ تھا بالآخر لارڈ کراس کے ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کی رو سے دستور میں اہم تبدیلیاں ہوئیں

وظائف مقننہ میں اضافہ ہوا۔ سب سے اہم امر یہ کہ اس ایکٹ کی رو سے انتخابی طریقہ کا رواج شروع ہوا۔ موازنہ پر بحث کی جانے لگی۔ گورنمنٹ کی پالیسی کے متعلق سوالات کرنیکا حق حاصل ہوا۔ اب کونسلیں صرف مشورہ دینے والی جماعتیں نہ رہیں۔ حکومت ہندوستانیوں کی رائے کو وقعت کی نظر سے دیکھنے اور ان پر غور اور ایک حد تک عمل کرنے لگی۔ ان مقننہ جماعتوں کے ہندوستانی عنصر (غیر کاری عنصر) میں بتدریج اضافہ بذریعۂ اصول انتخاب ہونے لگا۔ غرض کہ اس ایکٹ کے نفاذ میں لارڈ کراس وزیر ہند کی کوشش اور لارڈ ڈفرن کی سفارشات کو بڑا دخل ہے۔

۱۹۰۹ء میں مارلے منٹو اصلاحات عمل میں آئے اس زمانہ کے وائسرائے لارڈ منٹو نے ان اصلاحات کو منظور کرانے میں زیادہ حصہ لیا اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے ورنہ لارڈ مارلے وزیر ہند ان اصلاحات وجمہوری اداروں کے قیام کے مخالف تھے اور انہوں نے اپنی مخالفت کا اظہار دار الامراء میں بھی کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مجالس قوانین سازی میں اب بھی ہندوستانی عنصر کی حیثیت مشورہ دینے والی جماعت کی رہے۔ حالات اور واقعات کے مد نظر یہ خیال بعد از وقت تھا۔ اسلئے کہ ملک میں بے چینی بڑھ گئی تھی۔ تحریک دہشت انگیزی زوروں پر تھی احساس قومیت قوی ہونے لگا۔ تقسیم بنگال کے مسئلہ نے اس میں اضافہ کیا۔ جنگ روس وجاپان کا نفسیاتی اثر قابل لحاظ تھا۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھکر لارڈ منٹو نے پر زور سفارش کی کہ ہندوستانیوں کو مزید اختیارات دئے جائیں۔ چنانچہ اسمیں انھیں کامیابی حاصل ہوئی اور اس

ایکٹ کی رو سے حسب ذیل تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

(۱) اس کی رو سے جداگانہ طریق انتخاب عمل میں آیا۔ وزیر ہند مخلوط انتخاب کے حامی تھے۔ مسلم جماعت نے جداگانہ طریق انتخاب کی تائید کی۔ اسی زمانہ میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور ہز ہائینس آغاخان کی صدارت سے ایک وفد وائسرائے کی خدمت میں پیش ہوا۔ انھوں نے عرضداشت میں اپنے حقوق کی وضاحت کی تھی جس کو حکومت نے بنظر پسندیدگی دیکھا۔

(۲) اصول نامزدگی کو اب بھی قائم رکھا۔

(۳) گورنر جنرل کو حق تنسیخ حاصل تھا۔

(۴) ہندوستان میں بشمول برما مجالس وضع قوانین کل (۸) تھیں اور تعداد اراکین (۳۷۰) جن میں (۱۳۴) منتخب شدہ اور (۵۴) نامزدشدہ کل غیر سرکاری اراکین ۱۸۸ تھے اور سرکاری اراکین (۱۸۲) گویا غیر سرکاری عنصر زیادہ ہوا۔

(۵) وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانی رکن بھی شریک کیا گیا۔ پہلے رکن لارڈ سنہا ہیں ان کے بعد سر علی امام رہے۔

(۶) انڈیا کونسل میں دو ہندوستانی اراکین لئے گئے جن کی نامزدگی وزیر ہند کرسکتے ہیں۔

(۷) لفٹننٹ گورنر کی بھی مجالس قانون ساز اور بمبئی و مدراس کے گورنروں کی اکزیکیٹو کونسل قائم ہوئیں انہیں اختیار تھا کہ اکزیکیٹو کونسل کے اراکین کی رائے مسترد کردے۔

(۸) موازنہ پر بحث کی جاتی تھی۔ سفارشات ترمیمات و مسودات کو

پیش کرنیکا حق حاصل ہوا۔ عام اور پبلک میں اہمیت رکھنے والے مسائل پر بحث مباحثہ کا اختیار حاصل ہوا۔

(۹) اراکین میں سے کسی کو صدر مجلس وضع قوانین منتخب کرنیکا حق حاصل ہوا۔

غرض کہ اسکی تفصیلات بہت ہیں۔ چند اہم اُمور کا ذکر کر دیا گیا ہے اسکی رو سے ہندوستانیوں کو براہ راست اور کسی قدر وسیع پیمانہ پر مملکت کے انتظام میں حصہ لینے کا موقع حاصل ہوا۔ اس ایکٹ کی رو سے حقوق حاصل ہوئے ساتھ ہی یہ اپنے ساتھ مشکلات بھی لایا۔ جداگانہ فرقہ وارانہ اصول انتخاب متعدد مشکلات و پیچیدگیوں کا سنگِ بنیاد بنا۔ محدود حق رائے دہی اور بلاواسطہ اصول انتخاب نے غیر سرکاری اراکین کے حوصلے پست کر دئے۔ جنگ عظیم شروع نہ ہوتی تو اس ایکٹ کے خلاف احتجاج بہت پہلے شروع ہوتا۔ بعض صوبوں میں جہاں غیر سرکاری اراکین کی اکثریت تھی انہوں نے بعض ایسے قوانین وضع کرنیسے انکار کیا جن کو جماعت عاملانہ ضروری سمجھتی تھی۔ غرض کہ احتجاج میں شدت ہونیکی وجہ حکومت مجبور ہوئی کہ ہندوستانیوں کو مزید حقوق ادا کرے لارڈ مارلے وزیر ہند کا خیال تھا کہ انکے زمانہ میں نافذ کردہ اصلاحات میں بیس تیس سال تک کام آئیں گے مگر دس سال میں ہی ان پر نظر ثانی ہوئی اور ۲۲ر اپریل ۱۹۱۸ء کو مانٹ فورڈ اصلاحات عمل میں آئے۔ بین الاقوامی صورت حال نازک ہونے اور خود ہندوستان میں بے چینی حد درجہ بڑھنے کی وجہ حکومت نے مطالبات کو ایک حد تک تسلیم کیا مسٹر مانٹیگ وزیر ہند نے ہندوستان کا دورہ کیا یہاں کے والیان ریاست اور لیڈروں سے ملاقات کی حالات کا بغور مطالعہ کیا اب برطانیہ ہندوستانی

مسائل کو غور و فکر سے جانچ کرنے لگا۔ ہندوستانی دستوری تاریخ کی تشکیل میں مسٹر مانٹیگ کا درجہ لارڈ ڈلہوزی اور لارڈ ڈفرن سے بلند ہے۔ مانٹ فورڈ اصلاحات سے مندرجہ ذیل آئینی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

(۱) صوبہ واری مجالس کے اختیارات میں اضافہ ہوا، مرکزیت کی غیر معمولی اہمیت میں کمی ہوئی۔

(۲) آئندہ جماعت مقننہ ہند، ہندوستانی رائے دہندگان کے سامنے جوابدہ ہوگی۔

(۳) وائسرائے کی کونسل، کونسل آف اسٹیٹ اور مجلس مقننہ (لیجسلیٹو اسمبلی) میں مُبتدل ہوئی۔ صوبہ جات میں لیجسلیٹو کونسل اور گورنر کی اگزیکیٹو کونسل رہی۔

(۴) وائسرائے کے اختیارات میں اضافہ اور وزیر ہند کا ہندوستانی مسائل میں جو قابو تھا اس میں تخفیف ہوئی۔ قیام امن و انضباط میں وائسرائے... کی رائے کو ترجیح دیجاتی تھی۔

(۵) ہندوستانیوں کو بھی وزارتیں عطا کی گئیں۔ مجالس ضلع کے اختیارات میں بھی اضافہ کیا گیا طریق انتخاب جداگانہ ہی رہا اور عمل نامزدگی کو اس ایکٹ کی رو سے بھی جائز قرار دیا گیا۔ ہر امر نظم و نسق میں ہندوستانی عنصر میں اضافہ بتدریج ہونے لگا۔ ہندوستان کی جانب سے ہائی کمشنر کا تقرر انگلستان میں عمل میں آیا۔ مسٹر سنہا انڈر سکرٹری آف اسٹیٹ مقرر کئے گئے کونسل و اسمبلی میں بحث مباحثہ کی کافی آزادی رہی۔ ان جدید اصلاحات کی بھی ملک نے مخالفت شدت سے کی۔

جنگِ عظیم کے اختتام پر ہندوستانیوں کو انکی خدمات، ایثار کا صلہ نہ ملا۔ ان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی اسی لئے سیاسی تحریکات "ترک موالات" بائیکاٹ وغیرہ شروع کئے گئے۔ لارڈ ریڈنگ وائسرائے نے لیڈروں سے تبادلہ خیالات کیا۔ وزیر اعظم انگلستان نے اعلان کیا کہ یہ اصلاحات ایک "تجربہ" ہیں اسی نظر سے انہیں دیکھا جائے، انمیں تبدیلی ہوگئی مگر حالات میں یکسوئی نہ ہوئی گورنمنٹ مجبور ہوئی کہ ان تحریکات کے نقصانات کا انسداد کرنے۔ وائسرائے نے اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ہندوستان کے قائد مسٹر گاندھی گرفتار کئے گئے۔ دیگر مسلم و غیر مسلم لیڈر بھی گرفتار ہوئے۔ غرض کہ حکومت نے حالات پر قابو پالیا مگر قلوب غیر متاثر رہے۔ عدم تشدد کا مسلک جاری رہا لیکن تحریک دہشت انگیزی بھی زوروں پر تھی ملک کی عام بے چینی کو دیکھکر حکومت برطانیہ نے ایک شاہی کمیشن بغرض تحقیقات و سفارش، ہندوستان ۱۹۲۸ء میں بھجوایا جسکے صدر سر جان سائمن تھے اس کمیشن کا مقاطعہ کیا گیا محض اسلئے کہ اسمیں صرف برطانوی باشندے تھے کوئی ہندوستانی اسمیں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ حکومت برطانیہ اس کمیشن کی رپورٹ سے مطمئن نہ ہوئی اسلئے گول میز کانفرنس کا انعقاد لندن میں ہوا۔ ہندوستانی اور برطانوی مدبرین و والیان ریاستہائے ہند کی شرکت اور متحدہ کوشش رہی کہ ہندوستان کے لئے اسکی بیداری و ترقی کے مدِ نظر بہتر دستور مرتب کیا جائے اور اس کے اختیارات میں اضافہ ہو بہم کوشش کے بعد ۱۹۳۵ء میں قانون ہند وضع ہوا جس کا نفاذ جزءً ۱۹۳۷ء یکم اپریل کو ہوا۔ اس ایکٹ کی بھی مخالفت رہی

لیکن حکومت اطمینان دلانے پر کہ ہندوستانیوں کے معطیہ اختیارات میں بیجا مداخلت گورنروں سے نہ ہوگی اس کو قبول کیا۔ اس ایکٹ کے تحت مندرجۂ ذیل آئینی تغیرات ہوئے ہیں۔

(۱) صوبہ واری خود مختاری۔

(۲) وفاق۔

(۱) صوبہ واری خود مختاری۔ اسکی رو سے ہندوستان کے ہر صوبہ کو اختیارات عطا کئے گئے ہیں کہ اپنا انتظام آپ کرے نظم ونسق کی مشنری خود چلائے قوانین وضع کرے لیکن ایسے ابواب جو " تصور وفاق " کے تحت تمام صوبوں سے متعلق اور مشترک ہوں وہ مرکزی حکومت کے ذمہ رہے ہر صوبہ کا صدر گورنر ہوا کرتا ہے۔ یہاں کی وزارتیں جو جماعت کو اکثریت ہوتی ہے سنبھالتی ہے۔ صوبہ جات کی حدتک ہندوستانیوں کو کافی اختیارات عطا کئے گئے ہیں خالص ہندوستانی جماعتیں صوبہ جات کے مجالس متقننہ (کونسل واسمبلی) میں موجود ہیں۔ مقامی حالات کے اعتبار سے قوانین سازی کے کافی اختیارات حاصل ہیں۔ صرف گورنر جنرل کو پہلے حق تنسیخ حاصل تھا اب جدید ایکٹ کے تحت گورنروں کو بھی یہ اختیار عطا ہوا ہے ہندوستانی نمایندے اپنی رائے دہندگان کے سامنے جوابدہ ہیں اور انہی کے منتخب نمائندے وزارت کی خدمت انجام دیرہے ہیں۔

(۲) وفاق کا نفاذ ابھی نہیں ہوا ہے اس میں نہ صرف برطانوی ہند کی شرکت رہے گی بلکہ دیسی ریاستیں بھی شریک ہوں گی ہندوستانی ہند اور برطانوی ہند ان دونوں کا اجتماع اسمیں ہونے سے ایک عظیم تر ہندوستان ہوگا۔ شرکت وفاق

اور اسکو روبہ عمل لانے سے اسکے تفویض مشترک ابواب مثلاً سکہ ٹپہ ذرائع حمل ونقل ذرائع پیام رسانی مسئلہ تحفظ ہند، خارجی پالسی وغیرہ رہیں گے۔ جہاں تک کہ فوج مالیہ اور خارجی پالسی کا تعلق ہے اب بھی ان پر کامل اقتدار امپریل حکومت کا ہے ہندوستانیوں کو اسمیں زیادہ دخل نہیں ہے البتہ ان مسائل پر مجالس مقننہ و مرکزی میں بحث تمحیص، سوالات و ترمیمات و مسودات پیش ہو سکتے ہیں ان امور کی حد تک گورنر جنرل اپنے اختیارات خصوصی استعمال کرنیکا مجاز ہے۔

یوں تو اس دستور کی تفصیلات بہت ہیں لیکن ہم کو تفصیلات میں جانا نہیں ہے بلکہ اس دستور کے اثرات کو ظاہر کرنا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کو کافی حقوق عطا کئے گئے ہیں لیکن گورنر اور گورنر جنرل کے محفوظ اختیارات اس قدر اہم اور حاوی ہیں کہ انکے بعد بہت تنگ دائرۂ اختیارات کا رہ جاتا ہے جنمیں ہندوستانی عمل کر سکتے ہیں۔ اب بھی نامزدگی کو برقرار رکھا گیا ہے طریق انتخاب جداگانہ ہے، خاص اُمور کے قطع نظر مرکزیت کا اثر کم کردیا گیا ہے اسوقت تک یہاں کے دستور میں دو مفادات کام کیا کرتے تھے اب تین ہو چکے ایک تو صوبجاتی مفاد، دوسرا دیسی ریاستی تو تیسرا امپریل۔ ان تینوں کو متعارض نہ ہونے دینا مشکل اور انکو سنبھال کر حکومت کی مشنری چلانا نہایت اہم کام ہے اس دستور کے متعلق کسی قدر تفصیل سے کسی دوسرے مضمون میں بحث کرنا مفید ہوگا۔ فی الوقت نہایت اختصار کے ساتھ دستوری ارتقار کو پیش کیا گیا ہے۔ جتنی بھی ترقی اس خصوص میں ہندوستان نے کی ہے وہ اسکی جد وجہد اور ایثار کے مقابل بہت معمولی ہے۔ ابھی تک داخلی اختیارات کاملاً حاصل نہیں ہیں مستعمراتی درجہ سے

بہت دور ہیں۔ ایسی پست حالت میں اکثریت کا آزادی کے خواب دیکھنا اور معمولی اختیارات کے حصول سے ہی جامہ سے باہر ہونا عبرت انگیز ہے۔

ماہیت وفاق

مسئلہ وفاق کچھ عرصہ سے ہندوستان میں معرض بحث میں رہا ہے۔ اسکی تائید و تردید میں کافی لٹریچر موجود ہے تاہم وفاق کو روبہ عمل لانے کی گتھی تشفی بخش طریقہ پر سلجھائی نہ جاسکی۔

مسئلہ وفاق کے عملی پہلوؤں پر ملکی اخبارات کے ذریعہ بعض حضرات نے کافی روشنی ڈالی ہے اور اس کے اصول، دستوری کتب میں بالتفصیل درج ہیں لیکن اخبار بیں حضرات کو عام فہم طریقہ پر اس کے اصول سے روشناس کروانا ضروری سمجھکر ذیل کا مضمون درج کیا جاتا ہے امید کہ ناظرین اس کو ایک سرسری خاکہ سمجھکر مطالعہ فرمائیں گے۔

یوں تو دنیا میں مختلف قسم کی حکومتیں رہی ہیں۔ انسانی دماغ کے ارتقاء کے ساتھ اس میں بھی مختلف نزاکتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں مختلف قسم کی حکومتیں رہی ہیں۔ انسانی دماغ کے ارتقاء کے ساتھ اس میں بھی مختلف نزاکتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہی ہیں تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہے کہ دنیا میں استبدادیت کو زیادہ فروغ رہا ہے جمہوریت رعایا کے احساس پستی اور اسکے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ جمہوریت

انسانی دماغ کے ارتقار کا نتیجہ ہونیکی وجہ سے گوناگوں پیچیدگیوں اور نزاکتوں کی حامل ہے۔ اسکی عملی مثالیں سوزرلینڈ، امریکہ جرمنی وغیرہ کی حکومتوں میں پائی جاتی ہیں۔

ہمیں جمہوریت کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے بلکہ جمہوریت میں مقام وفاق کو دیکھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ جمہوریت رعایا کی حکومت ہے۔ رائے دہندگان اپنے چند نمایندوں کو منتخب کرتے ہیں اور انہی نمایندگان میں جو پارٹی اکثریت میں ہوگی وہی عنان حکومت سنبھالیگی۔ ایسی حکومت کا اقتدار بالآخر رائے دہندگان میں ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ چاہیں تو مقتدر پارٹی کو مجبور کرسکتے ہیں کہ وہ حکومت سے دست بردار ہوجائے۔ اسکی جگہ دوسری پارٹی لیتی ہے۔ وفاق ایک خاص نوعیت کی جمہوری حکومت ہے جو مختلف حصص ملک (صوبہ جات) پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر حصۂ ملک یا صوبہ داخلی امور میں خودمختار ہوتا ہے اور خارجی اُمور نیز مشترکہ ابواب میں مرکزی حکومت کا شریک ہوتا ہے جسکی تفصیل بعد آئیگی۔ وفاق دو قسم کی حکومتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ (۱) انفرادی (۲) اجتماعی یا مرکزی۔ انفرادی حکومت مقررہ حصص یا صوبوں میں ہوتی ہے۔ انہی صوبوں کے مشترک ابواب اور خارجی امور سے متعلق محکمہ جات کا تعلق براہ راست اجتماعی یا مرکزی حکومت سے ہوتا ہے۔ اس نوعیت کی حکومت سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ایسا حصہ یا صوبہ یعنے انفرادی حکومت اپنی انفرادیت کو اجتماعی حکومت میں ضم کردیتی ہے بلکہ وہ اپنی ہستی کو بذاتہ قائم رکھتی ہے اس کا یہ مفہوم نہیں کہ انفرادی (صوبہ واری) حکومت مقتدر ہوتی ہے بلکہ مقتدر اعلیٰ صرف وہ جماعت ہوتی ہے

جو وفاقی دستور کو تبدیل کر سکتی ہے۔ نیز یہ کہ صوبجات ایک مرتبہ شریک وفاق ہو جائیں تو پھر اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اگر علیحدہ ہونیکی لچک اس دستور میں رکھی جائے تو اسکو سیاسی اصطلاح میں "کانفڈریسی" کہا جاتا ہے یہاں ہمیں صرف فیڈرل گورنمنٹ یعنی وفاقی حکومت سے بحث ہے۔

کسی ملک میں وفاقی حکومت قائم کرنی ہو تو اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط لازمی ہیں۔

(۱) جغرافیائی سہولت (۲) معاشری و تمدنی یکسانیت

(۱) وفاق اسی ملک میں قائم کیا جاتا ہے جو جغرافیائی حیثیت سے مختلف حصص میں منقسم ہونیکے باوجود ایک دوسرے سے باسانی ربط قائم کیا جا سکتا ہو۔ قدرتی مواقع ایسے نہ ہوں کہ ان حصص ملک کو ایک کڑی میں لانیکے لئے غیر معمولی دقتیں ہوں ظاہر ہے کہ اگر غیر معمولی دقتیں ہوں تو ایک ہی نوعیت کی حکومت کا قیام تمام حصص میں دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ قدرتی امتناع نہ ہو تو وفاق کیلئے دوسرا اہم جزو یہ ہے کہ (۲) اس ملک کا تمدن و معاشرت ایک ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی ملک میں مختلف مذاہب اور زبانیں ہوں لیکن ان تمام کے پس پشت اس ملک کا تمدن اور معاشرت ایک ہونی چاہیے۔ اگر یہ نہ ہو تو باوجود خارجی طور پر وہ ملک ایک حصۂ ارضی میں ہونے کے اسمیں وفاقی حکومت کا قیام تقریباً ناممکن ہے، اگر یہ دو امور کسی ملک میں بدرجہ اتم موجود ہوں تو اسکی قومیت ایک ہوگی۔ فیڈریشن یا وفاق کا منتہی قومیت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احساس قومیت اس نوعیت کی حکومت کو جنم لینے میں مدد دیتا ہے لیکن اسمیں پختگی اور جلا، کا منیاط تو پر

وفاق چلنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

وفاق یونین (Union-) چاہتا ہے نہ کہ یونیٹی (Unity-)

ان دونوں سیاسی اصطلاحات کے فرق کو ملحوظ رکھنے سے صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ صوبہ داری حکومتیں اپنی انفرادیت کو قائم رکھتی ہیں نہ کہ مرکزی حکومت میں ضم کردیتی ہیں گویا وفاق میں دو قسم کے احساسات کارفرما ہوتے ہیں۔

(۱) اتحاد قومی۔ (۲) انفرادیت کی بقاء

وفاق ان دونوں خواہشات کو ربط میں لانیکی کوشش کرتا ہے۔ نیز صوبہ واری اور مرکزی اقتدار کو استوار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ان میں تعارض نہ ہونیکی ممکنہ کوشش کی جاتی ہے۔

وفاق کا وجود دستور سے ہوتا ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ دستور کس قسم کا ہونا چاہیئے یہ ایک اہم مسئلہ ہے تاہم مختصراً یہ کہ دستوری خصوصیات یہ ہونی چاہئیں۔

(۱) وفاقی دستور تحریری ہو (۲) غیر تبدیل پذیر ہو (۳) مقننہ صرف ذیلی قوانین وضع کرلے۔

(۱) تحریری اسلئے ہو کہ دستوری حکومت میں مختلف معاہدات تہہ نامجات ہوتے ہیں جو ظاہر ہے نہایت گنجلک ہوتے ہیں اور دستور کی بنیاد' روایات' اور سمجھوتوں پر رکھیں اور وہ تحریری نہ ہو تو غلط فہمی' ناراضگی پیدا ہونیکا قوی احتمال ہے لہذا دستور تحریری' غیر مبہم اور غلط فہمیوں سے معرا ہو۔

(۲) غیر تبدیل پذیر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وفاقی دستور کی تبدیلی آسان نہ بنائی جائے اسلئے کہ ممکن ہے اسکی سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھاکر حکومتوں

(انفرادی) کے حقوق تلف کیے جائیں یا وہ خود مختار ہو جائیں یعنی بجائے (Union) یونین میں رہنے کے یونیٹی (Unity) کے تحت آجائیں انہی احتمالات کو رفع کرنیکے لئے دستوری تبدیلی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرے اور اسکے لئے تمام پارٹیوں کی منظوری حاصل کی جائے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ ہر دستور تغیر پذیر یا ترمیم طلب ضرور ہوتا ہے اگر یہ نہ ہو تو امتداد زمانہ کے ساتھ حالات متغیرہ سے مطابقت نہ کر سکے گا جس سے بہت جلد وہ حکومت انحطاط کی طرف مائل ہو جائیگی غیر تبدیل پذیر سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ زیادہ تر نا قابل تغیر ہو اور اس میں ترمیم باآسانی نہ ہو سکے۔

(۳) ہر حکومت میں تین شعبے ہوا کرتے ہیں (ا) عاملہ (ب) عدلیہ (ج) مقننہ وہی ملک متمدن کہلانے کا مستحق ہے جہاں عاملہ ماتحت ہو عدلیہ کے۔ عاملہ کا کام صرف تعمیل ہے آئے دن کے قوانین واحکام کو خوش اسلوبی سے تعمیل کروانا اس شعبہ کا اہم فریضہ ہے۔

مقننہ ایک قانون ساز جماعت ہے۔ وفاقی دستور میں اس کا درجہ یہ ہے کہ وہ صرف ذیلی قوانین وضع کرلے۔ عدلیہ قانون کی تاویل وتعبیر کرتی ہے۔ وہ اس امر کی بھی مجاز ہے کہ مختلف صوبہ جات نیز اجتماعی (مشترکہ) مفاد سے متعلق امور میں کوئی نزاع ہو تو اس کا انفصال کرے نیز وہ اس امر کی بھی مجاز ہے کہ اگر کوئی قانون خارج از اختیار وضع کیا گیا ہو تو اس کو کالعدم قرار دے۔ دستور کی خلاف ورزی ہو تو اس کو روکدے اسی خلاف ورزی کے روکنے میں زبردست حصہ ملک کا ہوتا ہے تاہم ایک ایسی جماعت کا وجود ضروری ہے جو بے ضابطگیوں

اور خلاف ورزیوں کی روک تھام کرتی رہے۔ امریکہ میں یہی عمل ہے۔ غرضکہ ان تینوں شعبہ جات میں ربط و انضباط ضروری ہے اور اسی سے حکومت کی مشنری اطمینان بخش طریقہ پر چلتی ہے؛

وفاقی حکومت میں صوبہ جاتی حکومتوں پر دو قسم کی تحدیدات ہوتی ہیں:-

(۱) داخلی (۲) خارجی۔

داخلی پابندیاں یا تحدیدات یہ کہ صوبہ جاتی حکومتیں (انفرادی) اصول انصاف کو پیش نظر رکھکر اپنے دائرہ عمل میں آئینی طریق پر چلیں۔ معاہدات تہذیبات و روایات کی خلاف ورزی نہ کریں اور انکی پابندی و قدر کریں۔ (۲) دوسرے وہ ہیں جو مرکزی حکومت کی وجہ یا اسکی جانب سے عاید ہوتی ہیں۔ مثلاً آزاد تجارت کے سب پابند ہوں گے یعنی ایک صوبہ دوسرے صوبہ کے مال پر محصول عائد نکرے وفاقی حکومت کا سکہ ایک ہی ہوگا۔ ذرائع نقل و حمل و پیام رسانی مشترک رہیں گے خارجی پالیسی پر اختیار ( ) مرکزی حکومت کا براہ راست ہوگا جسکی وجہ بری و بحری وغیرہ فوج مرکزی حکومت کے تحت رہیگی۔ مرکزی حکومت کے اخراجات میں بلحاظ تناسب ہر صوبہ واری حکومت کا حصہ رہے گا۔ اس کے لئے مرکزی حکومت صوبہ جات پر ٹیکس عائد کر سکتی ہے۔ غرضکہ مشترکہ مفاد کا تعلق براہ راست مرکزی حکومت سے ہوگا۔ دیگر داخلی اُمور میں انفرادی (صوبہ واری) حکومت خود مختار رہیگی۔ غرضکہ ان دو قسم کی حکومتوں میں عضوی تعلق ہوگا۔

اس مختصر سے مضمون کے بعد ناظرین غور فرما سکتے ہیں کہ ہندوستان میں

وفاقی حکومت قائم کرنیکے لئے کس قسم کی دقتیں ہیں۔ مثذکرہ اصُول کو پیش نظر رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جغرافیائی حالت یا کثرت مذاہب یا اختلاف معاشرت و تمدن کی وجہ دشواری پیش نہیں آرہی ہے بلکہ دیسی ریاستوں کا وہ عنصر ہے جس کا خاص ریاسی موقف ہے انکی شرکت سے وہ صوبہ واری (انفرادی) حکومت کی تعریف میں آجائیں گے۔ اور انفرادی حکومت کے حقوق و فرائض کے متعلق مختصراً بیان کردیا گیا ہے اسکی تفصیل میں جانا یعنی اس عملی پہلو پر روشنی ڈالنا اس مضمون کا مقصد نہیں ہے۔

جدید دستور ہند

جدید دستور ہند کو قانون ہند ۱۹۳۵ء بھی کہا جاتا ہے۔ اس قانون کو برطانوی پارلیمان نے منظور کیا ہے جس کی رو سے ہندوستان کو اصلاحات عطاء کیے گئے ہیں۔ اس قسم کے اصلاحات رفتہ رفتہ حاصل ہوتے رہے ہیں۔ اس وقت تک جتنے اصلاحات اور حقوق حاصل ہوتے رہے وہ صرف برطانوی ہند سے متعلق تھے لیکن اس جدید دستور کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکی رو سے برطانوی ہند اور ہندوستانی ہند (دیسی ریاستیں) ان دونو کو سیاسی حیثیت سے جوڑا جارہا ہے ان دونو حصص ملک میں صدہا سال سے یگانگت نہیں رہی ہے اور آپسمیں غیر جانبدار رہے ہیں۔ لیکن جدید دستور کی رو سے ان دونوں کو متحد کرکے عظیم تر ہندوستان کے تصور کی تکمیل کی گئی ہے۔ ضرورت اسکی ہے کہ ہر ہندوستانی جدید

دستور سے کسی قدر واقف رہے بجز اس کے حالات حاضرہ سے دلچسپی نہیں سکتی۔

قانون ہند ۱۹۳۵ء کا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تو وہ ضخیم ترین مسودہ تھا جو اسوقت تک پارلیمان میں کبھی پیش ہوا۔ اسکی ترتیب کا آغاز ۱۹۲۸ء سے سائمن کمیشن کے ذریعہ ہوا۔ سفارشات سائمن کمیشن کے علاوہ گول میز کانفرنس لندن میں طلب کئے گئے جن میں برطانوی ہند اور ہندی مدبرین والیان ریاست و وزرائے ریاست نے حصہ لیا۔ کئی سال تک غور و خوض اور بحث و مباحثہ کے بعد ۱۹۳۵ء میں یہ مسودہ قانون کی شکل میں ظاہر ہوا اور اس کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ اس دستور کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کیلئے وفاق تجویز کیا گیا ہے مختلف حصص ملک کو ایک سیاسی رشتہ میں جوڑنے میں یہ تصور سیاسی و آئینی اکثر ممالک میں کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اس رشتہ کی وجہ سے وفاق میں شریک ہونیوالے ممالک کی انفرادیت زائل نہیں ہوتی یعنی وہ کسی دوسری ریاست یا ملک میں ضم نہیں ہوتے بلکہ اپنی خصوصیات و انفرادیت کو باقی رکھتے ہیں البتہ کسی قدر ایثار ضرور کرنا پڑتا ہے۔

جدید دستور ہند کے دو اجزا ہیں (۱) صوبہ واری خود اختیاری (۲) وفاق اول الذکر کا نفاذ ہو چکا ہے دوسرا جزو باقی ہے۔ یہاں جدید دستور کے محاسن و معائب بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف دستور ہند کو مختصراً ظاہر کرنا ہے تاکہ اس کا خاکہ سمجھ میں آجائے اور اس سے ناواقفیت نہ رہے۔ اس کو تفصیل سے ظاہر کرنے کیلئے کتاب کی ہی ضرورت ہوگی صرف اہم پہلو کو واضح کرنیکی کوشش کی گئی ہے۔

برطانوی ہند کی تقسیم | برطانوی ہند کی تقسیم گیارہ صوبوں میں کی گئی ہے جن پر گورنر

کا تقرر ملک معظم کیا کرتے ہیں، بمبئی، مدراس، بنگال، صوبہ جات متحدہ، پنجاب، بہار، صوبہ جات متوسط و برار، آسام، شمال مغربی سرحدی صوبہ، اوڑیسہ و سندھ ہیں۔ انکے علاوہ برٹش بلوچستان، دہلی، اجمیر مارواڑ، کورگ، جزائر انڈیمان نکوبار، علاقہ پنتھ پہلوواکے علاقے ہیں جن پر چیف کمشنروں کا تقرر گورنر جنرل کرتے ہیں۔ ان صوبوں و علاقوں کے رقبہ و حدود میں تبدیلی کرنیکی انگلستان کی پارلیمان ہی مجاز ہے۔ البتہ ملک معظم وزیر ہند کو ہدایت کریں گے کہ وہ پہلے وفاقی اور متعلقہ صوبہ جات کی رائے و خیالات معلوم کرے۔ اسکے بعد پارلیمان میں اسکی نسبت مسودہ پیش ہوگا۔ صوبوں میں گورنر تاج کی جانب سے عاملانہ اختیارات کا استعمال کرتے ہیں ہر صوبہ میں وزرار کی ایک کونسل ہوتی ہے جو گورنر کو فرائض خصوصی کے سوائے دیگر امور میں مشورہ دیتی ہے۔ قانونی مشورہ کیلئے ہر صوبہ میں ایک اڈوکیٹ جنرل مقرر کیا جاتا ہے۔ وزرار کی کونسل کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ جو جماعت اکثریت میں ہوتی ہے اس کے قائد کو گورنر... حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی کابینہ ترتیب دے۔ قائد اپنی جماعت کے قابل افراد کا خاص خاص وزرات کیلئے انتخاب کرتا ہے۔ جسکی منظوری گورنر صادر کرتا ہے۔

فرائض گورنر (۱) صوبہ میں قیام امن (۲) اقلیتوں اور ملازمین سرکار کے حقوق و مفاد کا تحفظ (۳) ریاست یا اس کے حکمران کے حقوق کا تحفظ (۴) دستور کی رو سے علٰحدہ کئے ہوئے علاقوں میں امن قائم رکھنا وغیرہ۔ یہ گورنر کے اختیارات خصوصی ہیں۔ گورنر جنرل کی طرح اس کیلئے محفوظ امور نہیں ہیں۔ البتہ آئینی حکومت کے خلاف دہشت انگیز اقدامات اختیار کئے گئے ہوں تو ان میں خاص اختیارات

رکھتا ہے۔

صوبائی مجلس قانون ساز | بعض صوبوں میں دو ایوانات اور بعض میں ایک ایوان قانون ساز ہے۔ مدراس، بمبئی، بنگال، صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ، بہار و آسام میں دو ایوانات ہیں۔ ایک کو کونسل اور دوسری کو اسمبلی کہا جاتا ہے۔ پنجاب، صوبہ جات متوسط و برار، اڑیسہ، شمال مغربی سرحدی صوبہ، و سندھ میں صرف ایک ایوان یعنی اسمبلی ہے۔ ان دو ایوانات کے علاوہ گورنر بھی بحیثیت نمایندہ تاج خصوصی اختیارات کے تحت قانون سازی کرتا ہے۔

طریق نمائندگی | ان ایوانوں میں نمایندگی جداگانہ اور فرقہ وارانہ ہوتی ہے نامزدگی بھی ہوا کرتی ہے۔ تناسب آبادی کے لحاظ سے نمایندگی ہوتی ہے۔ عورتوں کے لئے نشستیں مقرر کی گئی ہیں۔ نمایندگی کا انحصار فرقہ وارانہ فیصلہ (Communal award) پر ہے جس کو ملک معظم کی حکم کے بنا پر اور آپسمیں ہندوستانی نمائندے تصفیہ نہ کرسکنے کی وجہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم وقت نے ۱۶ اگست سنہ ۱۹۳۲ء میں فیصلہ صادر کیا۔ آپسمیں سمجھوتہ ہونے پر اب بھی اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ علٰحدگی اوڑیسہ اور میثاق پونہ سے اسمیں کچھہ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ میثاق پونہ کے ذریعہ ہریجنوں کو عام ہندوؤں سے علٰحدہ نہیں تصور کیا گیا ہے۔ اور سیاسی حیثیت سے وہ ہندوؤں کے ساتھ متحد تصور کئے گئے ہیں۔ اس سے چند نشستیں ہریجنوں کو بعض صوبوں میں زائد حاصل ہوئی ہیں لیکن ان کا مقصد پورا نہ ہوسکا ہنوز ہریجن اسی روایتی پستی میں ہیں۔

اسمبلی میں فرقہ وار فیصلہ کی پابندی ہوتی ہے مگر کونسل میں دشواری ہے۔

اگر کونسل کی نشستوں میں کمی ہو تو گورنر اپنی صوابدید سے اسکی تکمیل یا رفع کر سکتے ہیں اسمبلی کی میعاد پنج سالہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ درمیان میں نہ ٹوٹے۔ گورنر مجاز ہے کہ اسمبلی کے منظور کردہ کسی مسودہ کو منسوخ کرے یا کسی مسودہ کو پیش ہونیسے روکے

شرائط انتخاب ہر صوبہ کی تقسیم حلقہ ہائے انتخاب میں ہوا کرتی ہے اور ہر حلقہ کی فرد انتخاب مرتب ہوتی ہے جسمیں رائے دہندگان کے نام درج ہوتے ہیں جنکی عمر کم از کم اکیس سال کی ہو۔ اس دستور کے نفاذ سے قبل ہندوستان میں صرف تین فی صدی آبادی کو حق رائے دہی بربنار ملکیت جائداد حاصل تھا لیکن اب دس فیصد حصہ آبادی کو یہ حق حاصل ہے۔ اس سے قبل ہندو عورتیں مالک جائداد کم ہوا کرتی ہیں اسلئے سابقہ دستور کے لحاظ سے رائے دہندگان کی تعداد انکی کم تھی' موجودہ دستور کے لحاظ سے ہر وہ عورت جو بذات خود مالک جائداد ہو یا مالک جائداد کی زوجہ ہو' یا جن کے شوہر فوجی خدمت کی وجہ حق رائے دہی رکھتے ہوں یا فوجی پنشن (وظیفہ) یاب یا انکی بیوگان و مائیں یا باعتبار تعلیم رائے دہی کی مستحق ہوں' رائے دیسکتی ہیں۔ رہائش کے لحاظ سے مختلف صوبہ جات میں مختلف شرائط حق رائے دہی ہیں مثلاً مدراس میں یہ کہ رائے دہندہ سال گذشتہ اس حلقہ میں (۱۲۰) دن رہ چکا ہو۔ بمبئی میں (۱۸۰) دن کی شرط ہے۔ بنگال میں رائے دہندہ کی اس حلقہ میں مستقل سکونت لازمی ہے۔ دستور ہند کے ضمیمہ پنجم میں شرائط رائے دہی کی تفصیلات درج ہیں۔ ان تمام امور کا اظہار باعث طوالت ہوگا۔

صوبہ جاتی کونسل و اسمبلی کے اراکین کی کل فرقہ وارانہ فہرست کے بجائے

مختصر طور پر بلحاظ ضرورت اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے۔

صوبجاتی کونسل | مدراس۔ کل نشست ۵۰ عام نشستیں ۳۵ مسلمانوں کی نشستیں (۷) نامزدگی (۸) بمبئی کل (۲۹) عام (۲۰) مسلم (۵) نامزدگی (۳) بنگال۔ کل (۶۳) عام (۱۰) مسلم (۱۷) یوروپین (۳) اور (۲۷) نشستیں اسمبلی پُر کرے گی۔ نامزدگی (۶) صوبہ جات متحدہ کل (۵۸) عام (۲۴) مسلم (۱۷) نامزدگی (۶) بہار۔ کل (۲۹) عام (۹) مسلم (۴) نامزدگی (۳) آسام۔ کل (۲۱) عام (۱۰) مسلم (۶) یوروپین (۲) نامزدگی (۳)۔

صوبجاتی اسمبلی | مدراس۔ کل نشستیں (۲۱۵) عام نشستیں (۱۴۶) پست اقوام کے لیے محفوظ نشست (۳۰) مسلمانوں کے لئے (۲۸) کرسچین (۸) وغیرہ بمبئی۔ کل (۱۷۵) عام (۱۱۴) پست اقوام (۱۵) مسلم (۲۹) بنگال۔ کل (۲۵۰) عام (۸۰) پست اقوام (۳۰) مسلم (۱۱۷) یوروپین (۱۱) تجارت صنعت و حرفت باغبانی کانکنی کے نمائندے (۱۹) زمیندار (۵) نمائندے مزدور (۸) صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ۔ کل (۲۲۸) عام (۱۴۰) پست اقوام (۲۰) مسلم (۶۴) زمیندار (۶) پنجاب کل (۱۷۵) عام (۴۲) پست اقوام (۸)۔ سکھ (۳۱) مسلم (۸۴) زمیندار (۵) مزدور (۳)۔ بہار۔ کل (۱۵۲) عام (۸۶) پست اقوام (۱۵) پست قبائل کے نمائندے (۷) مسلم (۳۹) زمیندار (۴)

صوبہ جات متوسط و برار | کل (۱۱۲) عام (۸۴) پست اقوام (۲۰)۔ پست قبائل (۱) مسلم (۱۴) اینگلو انڈین (۱) یوروپین (۱) صنعت تجارت کانکنی (۲) زمیندار (۳) یونیورسٹی (۱) مزدور نمائندہ (۲) عورتوں کے لئے عام (۳)

آسام - کل (۱۰۸) عام (۴۷) پسپت (۷) پسپت قبائل (۹) مسلم (۳۴) صنعت وغیرہ (۱۱) مزدور (۴) -

شمالی مغربی سرحدی صوبہ | کل (۵۰) عام (۹) سکھ (۳) مسلم (۳۶) -

زمیندار (۲) اڑیسہ - کل (۶۰) عام (۴۴) پسپت قوم (۶) پسپت قبائل (۵) مسلم (۴) زمیندار (۲) سندھ کل (۶۰) عام (۱۸) مسلم (۳۳) یوروپین (۲) صنعت وغیرہ (۲) زمیندار (۲) مزدور (۱) دستور کے ضمیمہ چہارم میں آئینی اُمور کی فہرست دی گئی ہے جسکی نسبت وفاقی اور صوبائی جماعت قانون ساز قوانین وضع کرسکتی ہے اور ایک فہرست مشترک ابواب کی بھی درج ہے یہ فہرست طویل ہے اہم اُمور متعلق صوبہ جاتی مقننہ ذیل میں ظاہر کئے جاتے ہیں :-

(۱) قیام امن عامہ (۲) عدالتی تشکیل تنظیم وغیرہ یعنی انصاف رسانی (۳) پولس (۴) جیلخانے (۵) صوبہ کا پبلک قرضہ (۶) صوبہ جاتی پبلک سروس وکمیشن (۷) صحت عامہ (۸) ابتدائی تعلیم (۹) لوکل گورنمنٹ کی ترتیب وعطائے اختیارات (۱۰) پانی یعنی فراہمی آب" آبپاشی نہریں' نالیاں - نالے دریاؤں کے کنارے پانی کے ذخیرے اور قوت خانے (۱۱) ذرائع رسل ورسائل یعنی سڑکیں' پل' گھاٹ وغیرہ (جو وفاقی فہرست میں نہ ہوں) چھوٹی ریلیں میونسپل ٹراموئے وغیرہ (۱۲) زراعت یعنی زراعتی تعلیم ریسرچ اور پودوں کو تباہ کرنیوالے امراض کی تحقیق امراض مویشیان کا علاج تعلیم وغیرہ - (۱۳) جنگلات (۱۴) لگان اراضی - رکارڈ رکھنا - جمع کرنا پیمائش اراضی وغیرہ (۱۵) خیراتی ادارے ومذہبی عطیات (۱۶) زراعتی آمدنی پر ٹیکس (۱۷) پیشوں'

تجارتوں وغیرہ پر ٹیکس (۱۸) سامان عیش و قمار بازی کا ٹیکس (۱۹) راہداری۔ (۲۰) پولس ٹیکس (۲۱) زراعتی اراضی کی کاشت کے سلسلہ میں لگایا ہوا ٹیکس (۲۲) فروخت اشیاء اور اشتہارات پر ٹیکس (۲۳) فروخت و استعمال وغیرہ کیلئے وفاقی علاقہ میں اشیاء کے داخلہ پر ٹیکس (۲۴) جانوروں اور کشتیوں پر ٹیکس اس مختصر فہرست سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ صوبہ جاتی مقننہ سے کس قسم کے امور متعلق ہیں جنکی نسبت وہ قوانین وضع اور نافذ کر سکتی ہے۔

جدید دستور کے جزو اول یعنی صوبہ واری خود اختیاری کا مختصر ذکر ہو چکا اب اسکے دوسرے جزو یعنی وفاق اور وفاق سے متعلق اُمور کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنا مناسب ہوگا جو بجائے خود دلچسپ اور ناظرین بھی اس سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔

وفاق میں صوبے اور دیسی ریاستیں شریک رہیں گی۔ دیسی ریاستوں کے اصول شرکت اور ذمہ داریوں پر بعد غور کریں گے پہلے وفاقی اُمور پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ ہر حکومت میں تین شعبے ہوا کرتے ہیں عاملہ (حکومت عاملانہ) مقننہ (جماعت قانون ساز) و عدلیہ ان تین شعبوں پر وفاقی حکومت میں جسطرح عمل ہوتا ہے" غور کریں۔

عاملہ | گورنر جنرل نمائندہ ملک معظم ہوتا ہے جس کا ملک معظم اپنے دستخط سے تقرر کیا کرتے ہیں انہیں ملک معظم کی جانب سے ایک وثیقہ ہدایات بھی عطا ہوگا جس میں اختیارات استعمال کرنیکا طریقہ تبلایا جاتا ہے۔ عاملانہ ..... اختیارات عطاء کئے جاتے ہیں۔ اُمور مملکت میں وفاقی ہند سے متعلق جملہ عاملانہ کارروائیاں گورنر جنرل

کے نام سے ہوتی ہیں۔ اس عاملہ کو یہ بھی اختیار ہے کہ تاج کے جانب سے ہندوستان میں بحری بری اور فضائی (ہوائی) فوج کے لئے سپاہی بھرتی کرے اور رکھے قبائلی علاقوں سے متعلق حقوق بھی استعمال کر سکتا ہے اس قدر وسیع اختیارات کے باوجود اس پر دو تحدیدات عائد ہیں۔

(۱) صوبہ جاتی مقننہ کے اختیاری اُمور میں دخل نہ دے۔

(۲) وفاقی ریاستوں کے ان امور میں دخل نہ دے جو انکا کلیتہً اختیاری اور وثیقہ وشمولیت میں انکا اندراج نہ ہو۔ سپرد شدہ معاملات میں بھی والیٔ ریاست کو عاملانہ اختیار حاصل رہے گا بشرطیکہ وہ فسخ نہ کیا گیا ہو صدر شعبہ عاملانہ کی حیثیت سے گورنر جنرل کو افواج پر پورا اختیار ہوگا مگر کمانڈر انچیف کا تقرر ملک معظم کرینگے۔

اُمور محفوظ تین اُمور محفوظ ہیں جن میں گورنر جنرل صوابدید سے کام لیں گے البتہ وہ مشورہ کے لئے مشیروں کا تقرر کر سکتے ہیں جو تین سے زائد نہ ہوں اور یہ مشیر صرف گورنر جنرل کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ گورنر جنرل ان کے علاوہ دوسروں سے بھی مشورہ کر سکتا ہے۔ (ا) دفاع ملکی (ب) قبائلی علاقوں کے معاملات۔ (ج) اُمور مذہبی۔ یہ تین اُمور محفوظ ہیں۔

مشاورتی کونسل اس کونسل میں وفاقی مقننہ کے دس اراکین وزیر مقرر ہونگے جن کے مشورہ سے خصوصی ذمہ داریاں و اختیارات خصوصی و محفوظ اُمور کے سوائے دیگر امور انجام دیگا۔ گورنر جنرل کے صوابدید کے استعمال کا جہاں تک تعلق ہے وہ وزیر ہند کی ہدایات پر کام کریگا اور یہ ہدایات "وثیقہ ہدایات" سے مغائر ہونگے ان میں مشورہ دینے کا وزراء کو کوئی حق نہیں ہے البتہ گورنر جنرل چاہے تو مشورہ کر سکتا ہے،

گورنر جنرل مالی مشیر کو مقرر کرے گا جو مالی امور اور مسائل میں مشورہ دیگا اسکی علیحدگی، الاؤنس، اسٹاف وغیرہ گورنر جنرل کی صوابدید پر منحصر ہے وفاقی حکومت کیلئے ایک قانونی مشیر یعنی ایڈوکیٹ جنرل بھی مقرر کرے گا۔ یہ قانونی امور میں وفاقی حکومت کا مشورہ دے گا۔ برطانوی ہند کی تمام عدالتوں میں بسلسلہ ادائی فرائض اس کو حق سماعت حاصل ہوگا البتہ ریاستوں میں صرف ان مقدمات میں اسکو یہ حق حاصل رہیگا جن میں وفاقی حکومت کے مفاد کا سوال پیدا ہوتا ہو۔

گورنر جنرل کی چند خصوصی ذمہ داریاں یہ ہیں:۔

(۱) ہندوستان میں شدید خطرہ بدامنی ہو تو اسکا اندفاع اور ملک کو اس سے محفوظ رکھنا۔

(۲) اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ۔

(۳) وفاقی حکومت کے مالی استحکام و قیام ساکھ کی ذمہ داری۔

(۴) ملازمین سرکار کے جائز حقوق و مفاد کا تحفظ۔

(۵) برطانوی یا برمی تجارتی مال سے امتیازی سلوک کو روکنا۔

(۶) والی ریاست ۔ کے حقوق و وقار کا تحفظ۔

(۷) استعمال صوابدید و انفرادی رائے میں کوئی روک نہیں ہے گورنر جنرل ضرورت سمجھے تو وزرا سے مشورہ کریگا اور مشورہ کے بعد اس کے خلاف بھی عمل کر سکتا ہے یا ان کے مشورہ سے اختلاف کر سکتا ہے۔

مقننہ | وفاقی جماعت قانون ساز کے دو ایوان ہیں۔ (۱) وفاقی کونسل (۲) وفاقی اسمبلی۔

(۱) کونسل ایک مستقل جماعت ہے اس کو توڑا نہ جائیگا بلکہ ہر تیسرے سال اس کے ایک ثلث اراکین سبکدوش ہوا کریں گے اس کا انتخاب بلاواسطہ ہوگا اور عمر کم از کم ۳۰ سال ہو' اور یہ انتخاب فرقہ وارانہ ہوگا' صرف اینگلو انڈین' یوروپین اور کرسچین کا انتخاب بالواسطہ رکھا ہے یعنی صوبہ کی کونسل یا اسمبلی میں ان کے جو اراکین ہوں گے وہ اپنے نمایندوں کو منتخب کریں گے۔

ریاستی نمایندوں کو ان کے والیان ریاست منتخب کریں گے' کونسل میں برطانوی ہند کے (۱۵۶) اور ریاستوں کے (۱۰۴) اراکین رہیں گے۔ برطانوی ہند کی (۱۵۶) نشستوں میں صرف (۶) نشست گورنر جنرل اپنی صوابدید سے پُر کریں گے۔ یوں تو ریاستیں ہندوستان میں چھ سو سے زائد ہیں لیکن ان کے مرتبہ و اہمیت کے لحاظ سے نشست مقرر کی گئی ہیں جس کی تفصیل بعد میں آئیگی۔ مختصراً یہ کہ ۲۱ توپ کی سلامی اور مرتبہ کے لحاظ سے حیدرآباد کو (۵) نشست دی گئی ہیں۔ میسور' کشمیر' گوالیار' برودہ بھی (۲۱) توپ والی ریاستیں ہیں مگر (۳) نشست فی ریاست ہیں۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی ہیں اسلئے ان کا انتظام یہ کیا گیا ہے کہ چند ریاستوں کے حلقے بنائے گئے ہیں ان حلقوں کو ریاستیں باری باری سے اپنا نمایندہ بھجوایا کریں گی۔

(۲) اسمبلی :- اس میں انتخاب بالواسطہ ہوگا یعنی صوبجاتی اسمبلیاں وفاقی اسمبلی کے لئے نمایندے منتخب کریں گی اور یہ انتخاب فرقہ وارانہ اصول نیابت پر ہوگا۔ بعض جماعت و اقوام کیلئے خاص انتظام کیا گیا ہے اور نشستیں محفوظ کیگئی ہیں۔ اسمبلی میں برطانوی ہند کے (۲۵۰) اور ریاستوں کے (۱۲۵) نمایندے ہوا کرینگے

اور اسمبلی کی میعاد اگر وہ درمیان ہی نہ ٹوٹے تو پانچ سالہ ہوگی۔ ریاستوں کی نشست کی تقسیم آبادی کی بنا پر کی گئی ہے جسکی تفصیل بعد آئیگی۔ اسمبلی اور کونسل کا اجلاس سال میں ایک مرتبہ ضرور ہوگا۔ وزراء اور مشیر قانون سازی کی کارروائی میں حصہ لے سکتے ہیں مگر رائے نہیں دے سکتے کسی ذیلی کمیٹی کے وہ رکن بھی مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ ان ہر دو ایوانات کا ایک ایک صدر اور سپیکر ہوگا جو ایوان کے اراکین سے منتخب ہوگا۔ یہ دونوں غیر جانبدار رہیں گے یعنی انکا کسی پارٹی سے تعلق نہ ہوگا۔ ایک ہی رکن دونوں ایوانوں کا ممبر نہ ہو سکے گا۔ ان ایوانوں کا نصاب (کورم) کل اراکین کے ایک چھٹے حصہ سے پورا ہوگا۔ سرکاری ملازم بھی رکن نہیں ہو سکتا۔ وفاق یا صوبہ کے وزراء اور ریاستوں کے نمائندے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان ایوانوں میں اراکین کو تحریر و تقریر کی کافی آزادی حاصل ہے جیسی کہ انگلستان کے پارلیمان میں حاصل ہے ایوانوں کی میعاد کے زمانہ میں انھیں خاص مراعات حاصل ہوتے ہیں۔ ایوانوں میں وہ جو کہیں اسکے خلاف کارروائی ضابطہ نہ ہوگی اور نہ کوئی رپورٹ یا کارروائی قانون کی زد میں آئیگی جو کسی ایوانی جماعت یا رکن نے اپنی ذمہ داری سے شائع کی ہو۔ اس آئینی آزادی پر دو پابندیاں عاید ہیں:-

(۱) وفاقی جج یا رکن ہائیکورٹ کے طرز عمل پر ایوان میں بحث نہ ہو سکے گی جو اس نے بسلسلۂ ادائی فرائض اختیار کیا ہو۔

(ب) گورنر جنرل (باختیار استعمال صوابدید) یہ فیصلہ کرے کہ کسی مسودۂ قانون پر بحث یا اسکی ترمیم ہونے سے اسکی خصوصی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں فرق پڑتا ہے جو اسکو قیام امن کے سلسلہ میں حاصل ہیں تو وہ ہدایت کر سکتا ہے کہ

اس میں مزید کارروائی نہ کیجائے یا آغاز کی گئی ہو تو جاری نہ رکھے اسکے علاوہ گورنر جنرل بلحاظ ضرورت اور صدر یا اسپیکر سے مشورہ کرنیکے بعد حسب صوابدید یہ ہدایت کرسکتا ہے مندرجہ ذیل امور پر اراکین بحث نہ کریں۔

(۱) کسی ریاست کے متعلق ایسے سوالات کرنا یا ایسے حالات زیر بحث لانا جن پر وفاقی مقننہ کو قانون سازی کا اختیار نہ ہو۔ اگر یہ معاملہ وفاق کے مفاد یا برطانوی رعایا پر اثر انداز ہوتا ہو تو بلحاظ ضرورت اجازت دے سکتا ہے گورنر جنرل کی مرضی کے بغیر مندرجۂ ذیل امور معرض بحث میں نہیں آسکتے۔

(۲) ملک معظم یا گورنر جنرل اور بیرونی دول یا ہندوستانی ریاست کے تعلقات کی نسبت سوالات یا بحث کرنا۔

(۳) قبائلی علاقے اور خارج شدہ علاقوں کے انتظام کی نسبت سوالات دریافت کرنا۔

(۴) کسی صوبہ کے معاملہ میں گورنر جنرل نے حسب صوابدید عمل کیا ہو اسے معرض بحث میں لانا۔

(۵) کسی والی ریاست یا اسکے رکن خاندان کے ذاتی طرز عمل کے متعلق سوالات کرنا۔

مجالس مقننہ، عدالتیں نہیں ہیں۔ اگر کسی رکن نے بدنظمی پیدا کی تو اس کو ایوان سے باہر نکالا جاسکتا ہے، اراکین کو الاؤنس ملتا ہے۔ جملہ کارروائی بزبان انگریزی ہوگی اگر کوئی واقف نہ ہو تو دوسری زبان استعمال کرسکتا ہے۔

طریقہ قانون سازی بجز مالیاتی قانون کے دیگر ہر قسم کے قوانین دونوں ایوانوں

میں وضع ہو سکتے ہیں اور دونوں ایوانوں کی منظوری سے ہی قانون بنتا ہے اگر ایک منظور کرے اور دوسرا اتفاق نہ کرے تو گورنر جنرل مشترکہ اجلاس طلب کرے گا گورنر جنرل کسی مسودہ کو نامنظور کرسکتا ہے یا نظر ثانی کیلئے واپس کرسکتا ہے سالانہ میزانیہ پیش ہونے پر بحث ہوگی مگر رائے نہیں لیجائیگی۔

تقسیم اختیارات قانون سازی صوبہ جاتی و وفاقی مقننہ و گورنر و گورنر جنرل کو قانون سازی کے اختیارات حاصل ہیں اور یہ بغرض سہولت معین کر دئے گئے ہیں ورنہ مشکلات کا سامنا ہوگا۔ ہر ایک سے متعلق امور کی فہرست دی گئی ہے اور بعض امور مشترک رکھے گئے ہیں اگر انکے علاوہ کوئی اور امور نکل جائیں تو گورنر جنرل ذریعہ اعلان خصوصی اختیارات کے تحت وفاقی یا صوبائی مقننہ کو اختیار قانون سازی عطا کرسکتا ہے۔

وفاقی مقننہ کے اختیار قانون سازی پر حسب ذیل پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ بجز اجازت گورنر جنرل۔

(۱) برطانوی پارلیمنٹ کے کسی قانون میں تبدیلی ترمیم یا تنسیخ یا اسکے خلاف عمل نہیں ہوسکتا۔

(۲) گورنر جنرل یا گورنر کے کسی ایکٹ یا ہنگامی قانون کے مغائر یا اس میں تبدیلی، ترمیم، تنسیخ۔

(۳) گورنر جنرل کے امور متعلق بہ صوابدید پر موثر ہو۔

(۴) یوروپین یا برطانوی باشندوں سے متعلق کارروائی ضابطہ فوجداری پر اثر انداز ہو۔

(۵) برطانوی ہند کے باشندے یا کمپنی کے مقابل غیر ملک کے باشندے یا کمپنیوں پر زیادہ ٹیکس عائد کرنا وغیرہ۔

ہنگامی قوانین اگر کسی وقت وفاقی مقننہ کے اجلاس نہ ہو رہے ہوں اور فوری ضرورت ہو تو گورنر جنرل عارضی قوانین ذریعہ اعلان نافذ کر سکتا ہے تاج کی جانب سے ایسے قوانین عارضی نافذ ہو سکتے ہیں۔ گورنر جنرل صوابدید وانفرادی رائے کے استعمال کے سلسلہ میں ہر وقت عارضی قوانین نافذ کر سکتا ہے۔ نیز دستور میں اسکی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر وفاقی دستور معطل ہو جائے تو وہ فوری کارروائی کر کے وفاقی حکومت چلا سکتا ہے اسکے لئے وہ اعلان شایع کریگا البتہ وفاقی عدالت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا اور نہ اسکو توڑ سکتا ہے ایسے اعلان کو گورنر جنرل کسی وقت منسوخ کر سکتا ہے۔ اعلان ہونیکے بعد اس کو وزیر ہند کے پاس بھجوائے گا اور وہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کریگا۔ چھ ماہ بعد کالعدم ہوگا پارلیمنٹ بارہ ماہ کی توسیع کر سکتی ہے اس طرح تین سال تک حکومت اعلان کے ذریعہ چل سکتی ہے اسکے بعد پارلیمنٹ ضرورت سمجھے تو دستور میں ترمیم کریگی۔ صوبوں میں وفاقی حکومت بیکار یعنی معطل ہو جائے تو گورنر بھی اسی طرح عمل کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ گورنر اپنے اعلانوں کی تصدیق گورنر جنرل سے کرالے۔

وفاقی مجلس قانون ساز کا ذکر مختصر طور پر کیا گیا اب وفاقی کونسل اور اسمبلی میں برطانوی ہند کے نمایندوں کی بلحاظ ضرورت مختصر فہرست اور اس کے بعد وفاقی مقننہ سے متعلق امور کا ذکر کرنا مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے۔

کونسل۔ کل اراکین برطانوی ہند (۱۵۰) رہتے ہیں۔ ریاستوں کا ذکر بعد کیا جائیگا۔

مدراس کل نشست (۲۰) عام نشست (۱۴) مسلمانوں کے لئے (۴) پست قوم (۱) عورتوں کے لئے (۱)۔ بمبئی کل (۱۶)۔ عام (۱۰) مسلم (۴)۔ بنگال کل (۲۰) عام (۸) مسلم (۱۰)

صوبہ جات متحدہ کل (۲۰) عام (۱۱) مسلم (۷)۔ پنجاب کل (۱۵) عام (۳) مسلم (۸) سکھ (۴)۔ بہار کل (۱۶) عام (۱۰) مسلم (۴)۔ صوبہ جات متوسط و برار کل (۸) عام (۶) مسلم (۱) پست قوم (۱) آسام کل (۵) عام (۳) مسلم (۲)۔ سرحدی صوبہ۔ کل (۵) عام (۱) مسلم (۴)۔ اڑیسہ۔ کل (۵) عام (۴) مسلم (۱)۔ سندھ کل (۵) عام (۲) مسلم (۳)۔ برٹش بلوچستان کل (۱) عام × مسلم (۱) دہلی کل (۱) عام (۱)، اجمیر، ڈوڈر کل (۱)، کورگ کل (۱) عام (۱)! یوروپین (۷) کرسچین (۲) انگلو انڈین (۱)!!۔ اسمبلی :۔ اس میں صرف برطانوی ہند کے نمائندے (۲۵۰) رہیں گے جسمیں مسلم اراکین (۸۲) ہیں۔ مدراس کل نشست (۳۷) عام (۱۹) پست قوم (۹) مسلم (۸) صنعت و حرفت وغیرہ (۲) اناث (۲) بمبئی کل (۳۰) عام (۱۳) پست قوم (۲) مسلم (۶) بنگال کل (۳۷) عام (۱۰) مسلم (۱۷) پست قوم (۳)۔ صوبہ جات متحدہ وغیرہ۔ کل (۳۷) عام (۱۹) پست قوم (۳) مسلم (۱۲) پنجاب کل (۳۰) عام (۶) سکھ (۶) مسلم (۱۴) بہار کل (۳۰) عام (۱۶) پست (۲) مسلم (۹)۔ صوبہ جات متوسط و برار۔ کل (۱۵) عام (۹) پست قوم (۲) مسلم (۳) آسام: کل (۱۰) عام (۴) پست قوم (۱) مسلم (۳)۔ سرحدی صوبہ کل (۵) عام (۱) مسلم (۴) اڑیسہ۔ کل (۵) عام (۳) مسلم (۱) پست قوم (۱)۔ سندھ کل (۵) عام (۱) مسلم (۳) یوروپین (۱) بلوچستان۔ کل (۱) مسلم (۱)۔ دہلی۔ کل (۲) عام (۱) مسلم (۱)

اجمیر روڈ کل (۱) عام (۱) کورگ. کل (۱) عام (۱)۔ غیر صوبائی نشستیں (۴)

فہرست اُمور متعلق وفاقی مقننہ :۔

(۱) بحری، بری ہوائی افواج (ریاستوں یا صوبوں کی خارج ہیں) (۲) اُمور خارجہ (۳) اُمور مذہبی (۴) کرنسی، سکہ سازی۔ (۵) تار، ڈاک اور سیونگ بنکس (۶) مردم شماری (۷) آثار قدیمہ (۸) بندرگاہ پر قرنطینہ (۹) وفاقی ریلیں (۱۰) جہاز رانی (۱۱) کاپی رائٹ، ایجادات، ڈزائن، ٹریڈ مارک وغیرہ (۱۲) چیک، دستاویزات قابل بیع وشریٰ (۱۳) آتشگیر مادے (۱۴) سروے آف انڈیا (۱۵) قانون بیمہ۔ (۱۶) کارپوریشن ٹیکس (۱۷) نمک (۱۸) حکومتی کتب خانے (۱۹) وزنوں کا پیمان (۲۰) تمباکو وغیرہ غرضکہ یہ ایک طویل فہرست ہے جو دستور کے ضمیمہ چہارم میں دیگئی ہے مشترک فہرست جو وفاق اور صوبوں سے متعلق ہے حسب ذیل ہے :۔

(۱) تعزیرات ہند وضابطہ فوجداری ضابطہ دیوانی۔ (۲) نکاح۔ طلاق۔ تبنیت وغیرہ۔ (۳) وصیت نامے وصداقت نامجات وراثت (۴) ٹرسٹ (۵) تجارتی معاہدات (۶) ثالثی۔ دیوالہ، ناداری، سرکاری مٹرسٹی (۷) زہر اور مہلک دوائیاں (۸) قانونی وطبی پیشے وغیرہ (۹) اختیارات ومطابع (۱۰) محصول اسٹامپ (۱۱) فیکٹریاں کارخانے (۱۲) بے روزگاری کا بیمہ (۱۳) تجارتی انجمنیں و تنازعات (۱۴) متعدی امراض کا انسداد (۱۵) برقی قوت (۱۶) سینماؤں کی منظوری بغرض نمائش (۱۷) مزدوروں کی بھلائی وخوشحالی انسداد بیرحمی مویشیاں وغیرہ۔ (۱۸) مزمین وقیدیوں کا انتقال۔ (۱۹) زراعتی جائداد کے سوائے دیگر املاک کا انتقال

دستاویزات وغیرہ کی رجسٹری ۔

عدلیہ جدید دستور کے لحاظ سے ایک وفاقی عدالت بھی قائم ہوئی ہے جو دستور کی ترجمان اور محافظ ہوگی اس کا ایک میر مجلس ہوگا اور بقیہ اراکین ۔ اراکین کی تعداد کا تعین اور ان کا تقرر ملک معظم ہی کریں گے اور وہ (۶۵) سال کی عمر تک کام کرسکیں گے ۔ اس سے قبل وہ خود مستعفی ہوسکتے ہیں یا ملک معظم ، جوڈیشل کمیٹی سے استصواب کرکے انکی غلط روی یا جسمانی یا ذہنی کمزوری کی بنا، پر علیحدہ کرسکتے ہیں ۔ اس عدالت کے رکن (جج) وہی ہوسکتے ہیں ۔ جو برطانوی ہند یا کسی وفاقی ریاست میں پانچ سال تک عدالت عالیہ کے جج رہے ہوں یا انگلستان شمالی آئرلینڈ میں دس سال تک بیرسٹری کی ہو یا برطانوی ہند یا کسی وفاقی ریاست میں پلیڈر رہا ہو وغیرہ ۔ اس کے اجلاس دہلی یا اور مقامات پر بمنظوری گورنر جنرل ہوا کریں گے ۔

اس عدالت میں فریق مقدمہ صوبے اور وفاقی ریاستیں ہوا کریں گی یعنی صوبے بمقابل صوبے یا صوبے اور وفاقی ریاستیں یا وفاقی ریاستیں ہی آپسمیں فریق ہوں گے ۔ اگر کوئی وفاقی ریاست فریق مقدمہ ہو تو وفاقی عدالت اسوقت سماعت کرے گی جبکہ وثیقہ شمولیت کی رو سے وہ امر وفاقی عاملہ یا مقننہ کا اختیاری ہو یا وفاقی قانون ' ریاست میں نافذ کرنیکے سلسلہ میں سمجھوتہ ہو تو اس سے تعلق رکھتا ہو ۔ یا وفاقی مقننہ ریاست کی نسبت قانون نافذ کرسکتی ہو یا بر بنا سمجھوتہ مابین ملک معظم و دیسی ریاست ' تاج اپنے فرائض ادا کرنا ضروری ہو ۔

اس عدالت میں اپیل اسوقت ہوگی جب عدالت العالیہ سرٹیفکیٹ دے کہ

مقدمہ میں اہم قانونی سوال پیدا ہوتا ہے یا وفاقی مقننہ، منظوری گورنر جنرل ایک فہرست مرتب کر سکتی ہے کہ کون مرافعہ جات بلا سرٹیفکیٹ پیش ہو سکتے ہیں مگر مالیت کم از کم پچاس ہزار ہو۔ اگر ریاستی عدالت عالیہ میں قانونی امر غلط طور پر فیصل ہوا ہے تو مرافعہ ہو سکتا ہے وفاقی عدالت کے مقدمات کی اپیل جس حد تک کہ وہ امر دستور کی ترجمانی یا وثیقہ شمولیت سے متعلق ہو بلا منظوری وفاقی عدالت اور دیگر معاملات میں وفاقی عدالت یا ملک معظم با اختیار کونسل کی منظوری سے جوڈیشل کمیٹی میں ہوگی۔ کسی اہم قانونی مسئلہ پر وفاقی عدالت کی رائے گورنر جنرل حاصل کریگا۔ وفاقی عدالت اپنی رپورٹ مع اختلافی آرا پیش کرے گی۔ اس عدالت کی زبان نیز برطانوی ہند کی عدالت عالیہ کی انگریزی ہوگی۔ اس کا ایک اڈوکیٹ جنرل بھی ہوگا۔ عدالت عالیہ کے اراکین کا تقرر بھی ملک معظم کریں گے اور عمر کی شرط (۶۰) سال ہے ہر صوبہ میں ایک ایڈوکیٹ جنرل کا تقرر ہوگا۔ ڈسٹرکٹ ججوں کا تقرر بمشورہ عدالت عالیہ گورنر کریں گے۔

وفاقی مالیات دستور سازی کے مشکل ترین مسائل سے یہ بھی ایک ہے کہ مرکزی اور صوبوں کی حکومتوں کے درمیان مالی مسئلہ کی حد قائم کر دی جائے۔ مشترک ابواب کے انتظام کے لئے محصول وفاقی حکومت قائم ہونیکے بعد دس سال تک یہ ٹیکس عائد نہیں کیا جائے گا۔ اس مدت کے بعد بھی اگر والئی ریاست چاہے تو بجائے ٹیکس عائد کرنیکے اس کے مساوی رقم وفاقی خزانہ میں داخل کر سکتا ہے اگر یہ رقم تناسب سے زائد وصول کرنا ظاہر ہو تو والئی ریاست وفاقی عدالت میں اپیل کر سکتا ہے۔

رزرو بنک برطانوی ہند میں مالی استحکام کے لئے اسمبلی نے ۱۹۳۴ء

میں ایک مسودہ منظور کیا تھا کہ رزرو بنک قائم کیا جائے چنانچہ جدید ایکٹ میں اسکو بھی رکھا گیا ہے یہ بنک قائم ہوا ہے اس کا ایک گورنر اور دو نائب گورنر ہوتے ہیں جنکو گورنر جنرل باجلاس کونسل مقرر کرتے ہیں۔ بنک کی نگرانی اور انتظام ڈائرکٹروں کے ذمہ ہے چار ڈائرکٹر گورنر جنرل باجلاس مقرر کرتا ہے اور آٹھ ڈائرکٹر حصہ داروں کی جانب سے منتخب ہوتے ہیں منجانب گورنر جنرل ایک سرکاری ملازم (آفیسر) مقرر کیا جاتا ہے اس بنک کا سرمایہ پانچ کروڑ ہے۔ ایک حصہ سو روپیہ کا ہوتا ہے بلا اجازت گورنر جنرل کوئی مسودہ یا ترمیم مجلس قانون ساز میں پیش نہیں ہوسکتی جو سکہ سازی یا کرنسی یا بنک کے فرائض پر موثر ہوتی ہو اس بنک کے معاملات میں گورنر جنرل کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ وہ چاہے تو مرکزی بورڈ برخاست کرسکتے ہیں یا بنک کو دیوالیہ قرار دے سکتے ہیں۔ گورنر و نائب گورنر جنرل حسب صوابدید کام انجام دیتے ہیں۔

انتظام ریلوے ریلوے کی عام پالیسی کا تعلق وفاقی حکومت سے رہیگا مگر اس کا انتظام اور عاملانہ اختیارات ایک خاص جماعت کے سپرد رہیں گے اور یہ جماعت قوانین نافذہ کی پوری پابندی کرتے ہوئے اپنا اقتدار قایم رکھیگی اس جماعت میں سات اراکین اور انہی میں سے ایک صدر ہوگا جن کو گورنر جنرل مقرر کرے گا۔ تجربہ کار اشخاص ہی منتخب کئے جائیں گے۔ ان اراکین کی تنخواہ الاؤنس وغیرہ کا انحصار گورنر جنرل کی رائے پر ہے اور ایک چیف ریلوے کمشنر اور اس کی امداد کے لئے ایک فینانشل کمشنر مقرر ہوگا' یہ کافی تجربہ کار ہوں گے۔

یہ دونوں کمشنر ریلوے بورڈ کے جلسوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔ چیف کمشنر کو......ریلوے بورڈ گورنر جنرل سے مشورہ کے بعد ہی برخاست کر سکتا ہے اور فینانشیل کمشنر کو صرف گورنر جنرل علٰحدہ کر سکتا ہے۔ اس ریلوے جماعت کی تشکیل میں تبدیلی باجازت گورنر جنرل وفاقی مقننہ ذریعہ مسودہ کر سکتی ہے۔ ریلوے کا انتظام و کاروبار تجارتی اصول پر ہوگا البتہ عام پالیسی وفاقی حکومت قائم کریگی اور ان ہدایات پر یہ جماعت عمل کریگی۔ عام پالیسی کی نسبت وفاقی حکومت اور اس جماعت میں اختلاف ہو تو گورنر جنرل حسب صوابدید قطعی فیصلہ کر سکتے ہیں یہ جماعت ٹھیکے لے یا دے سکتی ہے اس پر دعوی ہو سکتا ہے اور یہ بھی بہ حیثیت کمپنی دعوی کسی پر کر سکتی ہے۔ اس جماعت کو ایک معاملہ میں زیادہ آزادی حاصل ہے وہ یہ کہ ریاستوں یا ریلوے کے... مالک یا ہندوستان کے متصل علاقوں سے سمجھوتہ کر سکتی ہے کہ زیر بحث ریلوے کا انتظام کن شرائط اور کن اشخاص کے ہاتھوں میں رہیگا ریلوے فنڈ بھی ہوگا جو اس کے ملازمین کے نفع کے لیئے قائم کیا جائیگا۔ آڈیٹر جنرل آف انڈیا ہر سال ریلوے کے حسابات کی جانچ کریگا اور ریلوے بورڈ (جماعت) ہر سال اپنی رپورٹ شائع کریگی گورنر جنرل ایک ریلوے شرح کی کمیٹی مقرر کرے گا جو وقتاً فوقتاً ریلوے شرح کی نسبت ریلوے بورڈ کو مشورہ وغیرہ دے گی۔

ریلوے عدالت اس عدالت میں ایک صدر اور دو اراکین رہیں گے۔ اس کا صدر وفاقی عدالت کے اراکین سے ہوگا اور اس کا تقرر بمشورہ میر مجلس وفاقی عدالت گورنر جنرل کریگا۔ جب تک وہ رکن وفاقی عدالت ہے اس عدالت کا

صدر بھی رہیگا۔ ریلوے بورڈ وفاقی ریاست اور متعلقہ افراد پر اس عدالتی احکام کی تعمیل ضروری ہوگی۔ قانونی امور میں اس عدالت کی اپیل وفاقی عدالت میں ہوگی اور اس کا فیصلہ قطعی ہوگا اور وہ ناقابل مرافعہ ہوگا انکی تنخواہ وفاقی خزانہ سے دیجائے گی۔ ریلوں سے تمام صوبے اور ریاستیں یکساں طور پر مستفید ہوسکتی ہیں۔ ریلوے بورڈ اور وفاقی ریاست اپنے اختیارات استعمال کرنے میں ناواجبی ترجیحات یا مسابقت کو نظرانداز کریں گے اگر ایسی صورت پیش آئیگی تو اس شکایت کو ریلوے عدالت کے سامنے پیش کیا جائیگا۔ دفاعی امور میں گورنر جنرل حسب صوابدید عمل کرے گا۔

ملازمتیں ہندوستانی افواج کے کمانڈر انچیف کا تقرر ملک معظم اپنے دستخط سے کریں گے۔ دفاع سے متعلق عہدوں کا تقرر ملک معظم کی جانب سے یا انکی ہدایات سے متعلق ہوگا۔ افواج کے فرائض کے متعلق قواعد و ضوابط وزیر ہند بمشورہ مشیران وضع کریں گے اور ان پر منظوری ملک معظم کی حاصل کی جائے گی افواج کی تنخواہ وفاقی مالیہ سے ادا ہوگی۔

سول سروس جدید دستور کی رو سے ان ملازمتوں پر جنھیں عرف عام میں سول سروس انڈین میڈیکل سروس، انڈین پولس وغیرہ کہا جاتا ہے وزیر ہند تقرر کیا کریں گے۔ ان عہدوں کی نسبت وزیر ہند ہر سال پارلیمنٹ میں بیان دینگے موزوں اشخاص کا اس میں تقرر کیا جائیگا۔

پبلک سروس کمیشن جدید دستور کی رو سے وفاقی اور صوبہ جاتی پبلک سروس کمیشن قائم ہوں گے۔ انکا کام یہ ہے کہ وفاقی اور صوبائی ملازمتوں کے لیے

امتحانات منعقد کریں۔ وفاقی کمیشن گورنر جنرل کی صوابدید سے اور صوبہ جاتی کمیشنوں کا تقرر گورنر کی صوابدید سے ہوگا۔ سرکاری ملازمتوں کے تقرر کے اصول ترقی، تبدل، معاملات نظم ونسق وغیرہ اُمور میں کمیشنوں سے مشورہ کیا جائیگا اور وہ صائب مشورہ دیں گے۔ دو صورتوں میں ان کمیشنوں کی رائے نہیں لی جائیگی جبکہ انکا تقرر (ملازمین کا تقرر) وزیر ہند یا گورنر جنرل یا گورنر نے حسب صوابدید کیا ہو دوسرے جبکہ ملازمتوں میں فرقہ وار تناسب کا مسئلہ درپیش ہو۔

وزیر ہند | قدیم دستاویز کے لحاظ سے پہلے وہ بزمانہ حکومت کمپنی، بورڈ آف ڈائرکٹرس کا صدر اور انگلستان کی کابینہ کا رکن ہوا کرتا تھا۔ اب بھی وہ رکن رہتا ہے اسکے اختیارات وسیع تھے اب انکی تخفیف کر دی گئی ہے انڈیا کونسل جو اسکی مدد و مشورہ کیلئے تھی اس کے اراکین میں کمی کی گئی ہے اب تین یا زیادہ سے زیادہ چھ اراکین ہندوستانی معاملات میں مشورہ دینے کیلئے اس کونسل میں رہیں گے۔ ان سے مشورہ کرنے میں وہ آزاد ہے کہ اسکے مطابق عمل کرے یا نہ کرے یا ان سے مشورہ لے نہ لے البتہ سرکاری ملازمتوں کے معاملہ میں اس کو آئینی طور پر اپنے مشیروں سے مشورہ لینا ہوگا۔ ہر مشیر کا تقرر صرف ایکمرتبہ پانچ برس کیلئے ہوگا اس کو برطانوی پارلیمان کی طرف سے سالانہ تیرہ سو پونڈ ملا کرینگے۔ ہندوستان میں بسے ہوئے مشیر انکو مزید چھ سو پونڈ سالانہ بطور معاشی الاؤنس دئے جائیں گے۔ قیام وفاق کے بعد سے وزیر ہند کے دفتر کے اخراجات برطانوی پارلیمان برداشت کرے گی۔

تاج اور دیسی ریاستیں | ہندوستان میں چھ سو سے زائد دیسی ریاستیں ہیں

بعض رقبہ میں بہت ہی چھوٹی ہیں تمام ریاستوں کے تعلقات تاج سے یکساں نہیں ہیں بلکہ بعضوں نے ماتحتی قبول کرلی ہے تو بعض نے سرپرستی منظور کرلی ہے بعض سے تعلقات مساویانہ ہیں ان مختلف عناصر کو ایک رشتہ میں جوڑنا نہایت مشکل مسئلہ دستوری ہے۔ تاج اور ریاستوں کے تعلقات بیشتر غیر تحریری معاہدات روایات وقدیم سمجھوتوں پر مبنی ہیں جسکی وجہ تاج اور دیسی ریاستوں کا موقف آپسمیں واضح نہیں ہے۔ اس کی وضاحت پر بٹلر کمیٹی اور گول میز کانفرنس میں زور دیا گیا مگر ہنوز یہ مسئلہ تشنہ ہی رہا ہے۔ شرکت وفاق پر تاج کی جانب سے مجبور نہیں کیا جائیگا بلکہ یہ والیان ریاست کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جن شرائط کے ساتھ چاہیں وثیقہ شمولیت میں درج کرکے شریک ہوں۔ ان شرائط کو تاج منظور یا نامنظور کریگا۔ یہ وثیقہ منظور کرلیا جائیگا تو وہ قطعی ہوگا اور وفاقی اختیارات کا اس ریاست میں عمل جاری ہو جائیگا۔ قیام وفاق کے بعد بیس سال تک مہلت دی گئی ہے کہ والیان ریاست شرکت کے لئے گورنر جنرل کے توسط سے ملک معظم کی خدمت میں وثیقہ پیش کریں اس مدت کے بعد شرکت چاہی جائے گی تو وفاقی ایوان گورنر جنرل سے درخواست کرے گا کہ ملک معظم کے پاس اس ریاست کی شرکت کیلئے سفارش فرمائیں۔ ہر والیٔ ریاست ایک ضمنی وثیقہ بھی پیش کریگا جسمیں ایسے امور درج ہوں گے جن کا تعلق وفاق سے نہ ہوگا مگر اسکی ترمیم پارلیمنٹ کے حکم سے ہوسکیگی۔ وثیقہ شمولیت منظور کرنیکے بعد ملک معظم کسی ریاست کو بیس سال تک ادائی ٹیکس سے معاف کرسکتے ہیں بشرطیکہ ریاستیں انکم ٹیکس کا ایک حصہ وصول کریں۔ اگر کسی ریاست نے فراہمی فوج کے معاوضہ میں کوئی علاقہ تاج کے نذر

کیا ہو تو اس کو یہ رقم دلوائی جائے گی۔ نفاذ دستور سے قبل کوئی بڑی رقم ریاست نے ادا کر دی ہے تو وہ واپس ہو گی۔ وفاقی مقننہ و عاملہ کے سلسلہ میں وفاقی ریاستوں کے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے یہاں اس کا اعادہ باعث طوالت ہو گا۔

وفاقی مقننہ میں ریاستی نمایندے والیان ریاست یا انکے باشندے ہونگے جو ذریعہ نامزدگی منتخب کئے جائیں گے۔ یہ والیان ریاست کے صوابدید پر ہے کہ وہ اپنی ریاست میں ذمہ دارانہ حکومت قائم کر کے وفاقی نمایندوں کو ذریعہ انتخاب منتخب ہونے کا موقع دیں۔ وفاقی کونسل میں ریاستی نمایندے (۱۰۴) اور وفاقی اسمبلی میں (۱۲۵) رہیں گے ریاستوں کی نمایندگی کا لحاظ آبادی، سلامی توپ وغیرہ پر رکھا گیا ہے بعض ریاستیں سلامی توپ کے لحاظ سے مساوی حیثیت رکھتی ہیں مگر آبادی کم ہے اس لیے نشستیں کم ملی ہیں۔ تمام ریاستوں کے کل سترہ ڈویژن کئے گئے ہیں۔ بعض ڈویژن میں متعدد ریاستیں شریک کی گئی ہیں جو باری باری سے اپنے نمایندے بھجوا سکتی ہیں۔ اگر ڈویژن کی بعض ریاستیں شرکت پر آمادہ ہوں اور بعض نہ ہوں تو خاص شرائط کے تحت مثلاً دو ریاستوں کے حکمران بھی شامل نہ ہوں تو تینوں نشستیں خالی رہیں گی یا چار ریاستوں کے حکمران شامل نہ ہوں تو تین میں سے دو خالی رہیں گی وغیرہ، انکی نشستیں پُر کی جاتی ہیں۔

ریاست حیدرآباد کیلئے کونسل میں (۵) اور اسمبلی میں (۱۶) نشستیں دیگئی ہیں۔ میسور کونسل (۳)، اسمبلی (۷)، کشمیر کونسل (۳)، اسمبلی (۳) وغیرہ اسکی تفصیلات بہت ہی ہیں وفاق اور دیسی ریاستوں کے تعلق کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے ہر ریاست کے شرائط مندرجہ وثیقہ شمولیت پر بھی اس کے تعلق کا انحصار ہے۔ شرائط کے اندراج

میں ہر ریاست اپنے سیاسی موقف، تاریخی عظمت، عمدہ نظم و نسق کا ضرور لحاظ رکھیگی۔ ان شرائط کے اظہار اور شرکت کے بعد ہی کسی ریاست کی پالیسی کے متعلق روشنی ڈالی جاسکتی ہے غرضکہ نہایت اختصار کے ساتھ اس ضخیم اور پیچیدہ قانون و دستور کو پیش کرنیکی کوشش کی گئی ہے تاکہ ہر تعلیم یافتہ شخص کے ذہن میں جدید دستور کا خاکہ رہے جو آنے والے سیاسی واقعات پر اثر انداز ہونیوالا ہے۔ فقط

کانگریس اور وفاق

ہندوستانی قومی کانگریس کی پنجاہ سالہ سیاسی جدوجہد کا یہ نتیجہ نکلا کہ سنہ ۱۹۳۵ء میں قانون ہند منظور ہوا جس کا جزءً نفاذ اپریل سنہ ۱۹۳۷ء میں ہوا۔ جزءً اس لئے کہ اس قانون کے دو اجزا ہیں (۱) صوبہ واری خود مختاری (۲) وفاق۔ اسوقت تک صرف جزو اوّل کا نفاذ عمل میں آیا ہے۔ جدید دستور کی تدوین میں کانگریس نے کم حصہ لیا اور ابتدا ہی سے اسکی شدت سے مخالفت کی۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد کانگریس میں اس مسئلہ پر اختلاف رہا کہ جدید دستور کے تحت انتخابات میں حصہ لیں یا نہ لیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ انتخابات میں حصہ لیں مگر عہدے قبول نہیں کرنا چاہئے۔ منجملہ گیارہ صوبوں کے سات صوبوں میں کانگریس کو انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس شاندار کامیابی پر کانگریس کی ایک جماعت میں حکومت و اقتدار کا شوق پیدا ہوا چنانچہ اس جماعت نے خیال ظاہر کیا کہ خاص شرائط کے ساتھ عہدے قبول کر لینا چاہئے۔ دوسری جماعت مخالف تھی۔ اس عرصہ

میں عارضی وزارتوں کا قیام عمل میں آیا۔ حکومت کوشاں تھی کہ اکثریت (کانگریس) عہدے قبول کرلے ورنہ امور مملکت میں ہر وقت اکثریت کی مخالفت کی وجہ سے دقتیں پیش آسکتی ہیں۔ فریقین کی جانب سے کوشش رہی، آخر اس سمجھوتہ پر کہ گورنر اپنے اختیارات خصوصی کے استعمال میں وزراء سے مشورہ کرلیں اور احتیاط برتیں۔ وزراء کے اختیارات میں مداخلت نہ ہو کانگریس نے سات صوبوں میں اپنی وزارتیں اس مسلک کے تحت قائم کیں کہ "اصلاحات کو توڑا جائیگا نہ کہ قابل عمل کیا جائیگا"۔ اور عارضی وزارتیں برخاست کی گئیں۔ برطانوی ہند کے گیارہ صوبوں میں کانگریسی اور غیر کانگریسی وزارتیں فرائض انجام دے رہی ہیں۔ قانون ہند ۱۹۳۵ء کے تحت صوبوں کو جو خود مختاری عطا کی گئی ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ صوبہ جات کی حکومتیں ہر معاملہ میں کلیتہً مختار ہیں بلکہ بعض مشترک امور مثلاً سکہ، ٹپہ، ریلوے، فوج، خارجہ پالیسی وغیرہ انکے حیطۂ اختیار سے باہر اور مرکزی حکومت یعنی وفاق سے متعلق رہیں گے صوبہ واری حکومتیں اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے وفاق میں شریک ہوں گی۔ انفرادیت کو مرکزی حکومت میں ضم نہیں کریں گی۔

کانگریس نے عہدے اس مقصد سے قبول کئے کہ اصلاحات کو عمل میں لانے میں رکاوٹیں پیدا کرے مگر وہ اپنے مسلک پر قائم نہ رہی۔ اقتدار حاصل کرنیکے بعد کانگریسی وزارتوں سے بعض ایسے افعال ظاہر ہوئے جو برطانوی حکومت سے کسی زمانہ میں خود کے خلاف سرزد ہونے پر کانگریس نے شدت سے احتجاج کیا تھا۔ اسکی تفصیلات میں جانا مضمون کے مقصد کے مغائر ہے۔ اب کانگریس کے پیش نظر مسئلہ وفاق ہے جس کی وہ اور ہندوستان کی دیگر سیاسی جماعتیں

مجوزہ وفاق کی نقائص کی وجہ سخت مخالف ہیں، لیکن اصولی وفاق پر تمام متفق ہیں۔

اس دستوری جزو کے نقائص ظاہر کرنے سے پیشتر یہ امر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ صوبوں کی خود مختاری کا مسئلہ خاص برطانوی ہند سے متعلق ہے لیکن دوسرے جزو یعنی وفاق دیسی ریاستوں سے بھی بقول لارڈ لن لتھگو موجودہ وائسرائے ہند اسلئے متعلق ہے کہ "ہندوستان میں اتحاد قائم کرنیکے لئے برطانوی ہند و ہندوستانی ہند کو ملانا .... اور ان میں دستوری رشتہ و اتحاد قائم کرنا ضروری ہے نیز یہ کہ اس وسیع ملک کے معاشی مسائل وغیرہ کی پالیسی چلانے کو موزوں مرکزی حکومت ناگزیر ہے اسی لئے وفاق میں تین فریق رہیں گے (۱) حکومت برطانیہ (۲) برطانوی ہند (۳) دیسی ریاستیں۔

دیسی ریاستوں کی خاص سیاسی وحدت و موقف ہے۔ وفاق میں شرکت کا خیال اور آمادگی اکثر والیان ریاست نے اسلئے ظاہر کی کہ وہ برطانوی ہندوستان کی آزادی کے متمنی اور انکی جد و جہد سے انھیں ہمدردی بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ دیسی ریاستیں جن کا وجود زیادہ تر غیر تحریری سمجھوتوں اور قدیم روایات و حکومت بالادست کے صوابدید پر ہے شرکت وفاق سے قانون پر منحصر رہیگا اور یہ کہ ریاستوں کے داخلی معاملات میں حکومت برطانیہ کی مداخلت نہ ہوگی۔ ریاستوں کو وفاق کی شرکت میں جو دقتیں اور بقیہ دو فریق سے ربط و اتحاد قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش اور شرکت وفاق سے جو ذمہ داریاں عاید ہوں گی ان کا ذکر اور کانگریس کی جو پالیسی دیسی ریاستوں کی شرکت وفاق سے متعلق ہے اس کا

اظہار کرنے سے پہلے مجوزہ وفاق میں قومی نقطۂ نظر سے جو اہم نقائص پائے جاتے ہیں انھیں واضح کر دینا ضروری ہے تاکہ وفاق کے خاکہ کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

(۱) گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی کثیر اور اس کے صوابدید کا دائرہ وسیع ہے۔

(۲) انگریزوں کے معاشی و مالی مفاد کو مقدم اور کافی طور پر محفوظ کیا گیا ہے۔

(۳) فوجی اخراجات اور اسکی پالسی نیز امپیریل ملازمتوں پر وزرار کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

(۴) مرکز میں (۸۰) فی صدی آمدنی پر ایوان کی کوئی رائے نہیں لی جائیگی بقیہ (۲۰) فی صد کی نسبت بھی بشرط ضرورت گورنر جنرل اختیار خصوصی استعمال کر سکتا ہے۔

(۵) ریلوے کا نظم ونسق کلیتہً گورنر جنرل کے صوابدید پر ہے۔

(۶) رزرو بنک پر بھی اسکا اختیار ہے وزراء کو کرنسی اور مبادلہ کے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔

(۷) برطانوی تجارت کو تامین و تحفظات عطا کئے گئے ہیں۔

(۸) خارجہ پالسی اور مسئلہ دفاع پر وزرار کا اختیار نہیں۔

(۹) گورنر جنرل اختیارات خصوصی کے ذریعہ شہری حقوق سلب کر سکتا ہے۔

(۱۰) وفاقی ایوان ذیلی میں بالواسطہ طریق انتخاب رکھا گیا ہے۔

(۱۱) وفاقی مقننہ میں ریاستوں کو زیادہ نشستیں دی گئی ہیں اور یہ کہ انکے نمایندے والیان ریاست کے نامزد کردہ رہیں گے نہ کہ رعایا کی جانب سے ذریعہ انتخاب منتخب ہوں گے۔

(۱۲) ۱۹۱۱ء کے قانون پارلیمان انگلستان کی رو سے دار الامراء کے اقتدار میں قابل قدر تخفیف ہوئی ہے اور دار العوام کے اختیارات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

باوجود اس کے زیر بحث دستور ہند کی رو سے ہندوستانی سیاسی امور میں دار الامراء کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا ہے۔ دار العوام کے منظور کردہ مسودہ کو منسوخ کرنیکا اس کو حق دیا گیا ہے تاکہ وہ ہندوستانی ترقی یافتہ سیاسی اقدام کو روکے۔ اس کا راز یہ ہے کہ انگلستان میں پارٹیاں بدلتی اور برسر اقتدار آتی رہتی ہیں اور ہاؤس آف لارڈز (دار الامراء) میں اکثریت قدامت پسندوں کی رہتی ہے اور ایسی تبدیلی کم ہوتی ہے اسی لئے اگر کوئی پارٹی جو برسر اقتدار ہو اس کو ہندوستانی سیاسی امور سے دلچسپی اور ترقی سے ہمدردی ہو بھی تو دار الامراء کی منظوری کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ دار الامراء کے اراکین سے ہمدردی کی توقع کرنا خلاف دانشمندی ہے گویا مقتدر پارٹی پر بھی اس دستور کے ذریعہ ایک پابندی عائد کی گئی ہے۔ غرض کہ یہ اور اسی قسم کے اعتراضات اس دستور کے متعلق کئے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرکز میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہر سیاسی جماعت کا یہ خیال ہے کہ اس دستور میں تبدیلی و ترمیم ہو۔ اصول وفاق کے تمام حامی ہیں اسلئے کہ بقول لارڈ لوتھین ہندوستان کے لئے دستوری اتحاد و وحدت ضروری ہے جہاں

تمدنی یکسانی ہو وہاں لازمی نہیں کہ دستوری اتحاد بھی ہو۔ اسی دستوری اتحاد کے فقدان کے سبب آج یورپ میں کافی بدامنی و بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ یورپ میں (۲۶) مقتدر ریاستیں موجود ہیں لیکن کسی ریاست کو دوسرے پر اعتماد نہیں ہے ہر آن جنگ و حملہ کا خوف لگا ہوا ہے اسی لئے جنگی تیاری و دفاع میں وہاں دو ہزار کروڑ روپیہ سالانہ صرف کیا جاتا ہے اور ہندوستان میں صرف ۸۴ کروڑ۔

شرکت وفاق کی اہمیت جتاتے ہوئے لارڈ موصوف نے مجوزہ وفاق ہند کی ترمیم کی بھی سفارش کی ہے مثلاً وفاقی وزارت قائم ہونیکے بعد اس کو دفاع اور خارجہ پالسی پر صاف و مفصل گفتگو کرنیکا اختیار حاصل ہو اور دستور پر نظر ثانی کرنے حکومت رضامند ہو۔ مسٹر کاکس نے دار العوام میں بدوران تقریر یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستانی دستور غیر تبدیل پذیر (RIGID) ہے اس زمانہ کے وزیر ہند سر سموئیل ہور نے بھی یہ خیال ظاہر فرمایا کہ یہ دستور غیر تبدیل پذیر ضرور ہے لیکن ہندوستان کے خاص حالات کے تحت ایسا کیا گیا ہے اور پارلیمنٹ بلحاظ ضرورت اس پر نظر ثانی اور اسمیں ترمیم کرلے گی۔" سر جان سائمن نے بحیثیت صدر سائمن کمیشن اپنی رپورٹ میں یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ دستور ایسا ہو کہ ملک کے سیاسی ارتقار اور حالات زمانہ کے ساتھ اس میں بھی تدریجی طور پر ترقی کرنیکی لچک اور صلاحیت ہو لیکن اس کا لحاظ جدید دستور کی تدوین میں نہیں کیا گیا۔

وفاق کی اہمیت اور موجودہ دستور کے نقائص ظاہر کرنیکے بعد وفاق کی نسبت کانگریس کا جو رجحان اور پالسی ہے اس پر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔

کانگریسی وزارتوں کے قیام کے بعد ان صوبوں میں یہ مسودہ منظور کیا گیا کہ ایسا دستور جو خود مختاری پر منحصر اور رعایا کے منتخب کردہ نمایندگان کے ذریعہ مرتب کیا گیا ہو قابل قبول ہوگا اسمیں بیرونی اقتدار کی مداخلت نہ ہو"۔ اس طرح کانگریس نے جدید دستور کو مسترد کیا اور ہری پور کانگریس بابتہ ۱۹۳۸ء میں وفاق کی نسبت دو اعتراضات ایک مسودہ میں ظاہر کئے گئے۔ یہ کہ مجوزہ وفاق کی کوئی حقیقی اساس نہیں ہے اس لئے دیسی ریاستیں جہاں ذمہ دارانہ حکومت شہری حقوق کا فقدان اور وفاقی ایوان کے انتخاب کی موزونیت میں صوبوں کے درجہ تک نہیں پہنچے انھیں بھی اس میں شریک کیا گیا ہے"۔ دوسرے یہ کہ وفاق میں حکومت کے اہم اور ناگزیر فرائض مثلاً دفاع اور امور خارجہ وغیرہ ذمہ دار حدود سے باہر ہیں یعنی وزراء کو ان امور میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے"۔ اس کے علاوہ بعض کانگریسی اراکین نے انفرادی طور پر اپنے خیالات اس کے متعلق ظاہر کئے ہیں جنکا ذکر کردینا ضروری ہے مثلاً مسٹر سبیتا موریتی نہ صرف عہدے قبول کرنیکی تائید میں پیش پیش ہیں بلکہ مجوزہ وفاق کو قبول کرنے پر بھی وہ آمادگی ظاہر کر رہے ہیں اگرچہ ان کا خیال ہے کہ متذکرہ بالا نقائص وفاق دور کئے جائیں اس کے باوجود اگر اس میں تبدیلی یا ترمیم نہ ہو تو کانگریس کو چاہئے کہ وفاق قبول کرلے۔ وفاقی مقننہ میں زیادہ سے زیادہ نشست پر قبضہ حاصل کرلے مگر وفاقی عہدے قبول نہ کرے۔ عارضی وزارتیں قایم ہونے دے اور انھیں شکست دے تاوقتیکہ حکومت قوم کی مرضی کے مطابق دستور میں ترمیم و تبدیلی کرنے پر مجبور نہ ہو جائے ایسی صورت میں صوبہ واری وزارتیں مستعفی نہ ہوں بلکہ وفاقی مقننہ کے احکام کی تعمیل نہ کرے۔ گورنر جنرل اختیارات خصوصی استعمال کرے تو

اس کی تعمیل سے انکار کرے وغیرہ گویا انکا خیال ہے کہ حکومت سے داخلی اور آئینی طور پر مقابلہ کرے اور اس عمل سے حکومت ترمیم کرنے پر مجبور ہوگی۔ اس اظہار خیال کی مخالفت کی گئی صدر کانگرس مسٹر بوس نے اس خیال کی سختی سے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر سیتا مورتی کی رائے انفرادی ہے نہ کہ کانگرس کی۔ اور وفاق کی نسبت کانگرس کی پالیسی غیر مبہم اور واضح ہے کہ جب تک مجوزہ وفاق میں تبدیلی نہ ہوگی اس کو کانگرس ہرگز قبول نہ کریگی اور اسکی شدت سے مخالفت کریگی۔

حکومت کی جانب سے اس امر کا اطمینان اور یقین دلانیکی کوشش کیجارہی ہے کہ گورنر جنرل بلا وزراء کے مشورہ کے اختیارات خصوصی کا استعمال نہ کریگا اور اسکی تائید میں یہ کہا گیا ہے کہ صوبہ واری وزارتوں کے قیام کے قبل اسی قسم کی بے اطمینانی و عدم اعتماد کا کانگرس نے اظہار کیا تھا کہ گورنر خصوصی اختیارات بلا مشورہ وزراء استعمال کریں گے اور وزراء کی آزادی عمل میں مداخلت کریں گے لیکن اطمینان دلانیکے بعد کانگرسی وزارتیں بلا روک ٹوک فرائض انجام دیرہی ہیں اور کوئی بدمزگی پیدا ہونے کی نوبت نہ آئی۔ جب کہ یہ مشاہدہ ہے تو کانگرس کو چاہیئے کہ گورنر جنرل کے اطمینان دلانے پر وفاق قبول کرلے" اس کا جواب بعض کانگرسی اراکین یہ دیتے ہیں کہ صوبہ واری اور مرکزی دستوری پہلو میں نمایاں فرق ہے مرکزی حکومت سے برطانوی مفاد زیادہ وابستہ ہیں۔ صوبوں سے کم ——— اس لئے برطانوی مفاد کے خلاف عمل ہوگا تو وہ زیادہ رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ نیز یہ کہ گورنر جنرل یقین دلانیکے باوجود بعض ایسے امور ہیں جو اسکی

نفی کرتے ہیں مثلاً محکمۂ فوج، کلیتہً گورنر جنرل اور وزیر ہند کے اقتدار میں ہے خارج شدہ علاقے، کمشنروں کے صوبے، والیان ریاست کے نامزد شدہ اراکین ذیلی ایوان میں، بالواسطہ انتخاب وغیرہ ایسے نامناسب اُمور ہیں جو کسی درجہ اطمینان دلانے پر بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتے اسلئے بجائے اس طرح یقین دلانے کے دستور میں ترمیم کردینا ضروری و مناسب ہے۔ فی الحقیقت کانگریس وفاق کی مخالف ہے یا نہیں اور دیسی ریاستوں کی شرکت وفاق کی نسبت کانگریس کا جو رجحان اور پالسی ہے اس کو مبرہن نہ کیا جائے گا تو مضمون تشنہ اور اس کا اہم پہلو غیر واضح اور کانگریس کی سیاسی چال راز میں رہیگی۔ وفاق کے نفاذ کے ساتھ ہی صوبہ جات مرکز سے متعلق ہو جائیں گے لیکن ایسی ریاستیں مجبور نہیں کہ وہ بھی شریک ہوں یہ انکا اختیاری فعل ہے اور شرکت کیلئے وہ مخصوص شرائط پیش کر سکتی ہیں جنکی منظوری یا نامنظوری کا اختیار تاج کو حاصل ہے۔ شرائط پیش کرنے میں وہ آزاد ہیں لیکن وہ ایسے ہوں کہ اصول وفاق کے مغائر نہ ہوں۔ والیان ریاست جن اُمور کو اپنی مرضی سے مرکزی حکومت کے سپرد و متعلق کریں گے انہی اُمور میں مرکزی حکومت دخل دیگی بقیہ میں نہ وفاقی عدالت دخل دیگی نہ حکومت عاملانہ اور نہ انکی فرمانروایانہ حیثیت میں تخفیف ہوگی۔ مرکزی حکومت کا تعلق مشترک ایوان سے ہے مثلاً سکہ، ٹپہ ریلوے وغیرہ اگر کوئی ریاست ان اُمور کو مرکزی حکومت کے سپرد کرنے میں سہولت اور منفعت بخش سمجھتی ہے تو کر سکتی ہے۔ اگر شاہانہ اقتدار قائم رکھنے کے خیال سے سپرد نہ کرے تو اس کو معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔

دیسی ریاستوں کی خاص سیاسی وحدت ہے اور انھیں برطانوی ہند کا جزو نہیں کہا جاسکتا تاہم انکی شرکت، وفاق کو روبہ عمل لانیکے لیئے ضروری قرار دی گئی ہے۔ جبکہ ہندوستان میں دیسی ریاستیں تقریباً سات سو اور اس کا رقبہ ۷ لاکھ مربع میل اور آبادی ہندوستان کی آبادی کا ⅕ حصہ ہے۔ انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دیسی ریاستوں کے لیئے وفاق میں ۱۰۴ نشستیں دی گئی ہیں۔ یہ نمایندے ذریعہ نامزدگی منتخب ہوں گے نہ کہ رعایا کی جانب سے ذریعہ انتخاب۔ نفاذ وفاق کیلیئے تمام ریاستوں کی شرکت ضروری نہیں بلکہ ریاستی آبادی کے نصف حصہ پر حکمراں ریاستیں شریک ہوں یا مجموعی حیثیت سے (۵۲) اراکین بھیج سکتی ہوں تو کافی ہے نشستوں کی تقسیم کا کوئی خاص اصول نہیں ہے۔ کہیں تقسیم آبادی کا اصول تو کہیں جغرافی اہلیت یا تعلقات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ غرضکہ شرکت وفاق کے معاملہ میں دیسی ریاستوں پر کوئی جبر نہیں ہے یہ کلیتہً انکی صوابدید پر منحصر ہے کہ جن شرائط کے ساتھ چاہے شریک ہوں۔ لارڈ لوتھین نے نفاذ وفاق کے متعلق یہ شرط مقدم ظاہر کی ہے کہ "جو دیسی ریاستیں وفاق میں شریک ہونا چاہیں وہاں ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو۔" اور کانگریس کا یہ اعتراض ہے کہ وفاق میں ریاستیں بہ حیثیت ریاست شریک نہیں کیجاتیں بلکہ والیان ریاست نمایندوں کو نامزد کریں گے اور یہ اراکین رعایا کے منتخب کردہ اور نمائندے نہ ہوں گے بلکہ والیان ریاست کے" اسی لیئے کانگریس کا مطالبہ ہے کہ "پہلے دیسی ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو۔" کانگریس کے ان ہی خیالات سے متاثر ہو کر ایک رکن نے ریاست اور نگو

کی مجلس مقننہ میں یہ تحریک پیش کی کہ ریاست ٹراونکور میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی فوری تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس پر دیوان سر راما سوامی ایر نے جواب دیا کہ "حکومت بالادست اور ریاست ٹراونکور کے مابین جو معاہدات ہوئے ہیں وہ ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے مانع ہیں جسکی تائید بٹلر کمیٹی کی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ بہ حالت موجودہ حکومت بالادست کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ذمہ دارانہ حکومت عطا کرے۔" اسی زمانہ میں انگلستان کے دار العوام میں رکن پارلیمان نے سوال کیا کہ آیا دیسی ریاستوں میں قیام ذمہ دارانہ حکومت کی حکومت بالادست مخالف ہے تو نائب وزیر ہند ارل ونٹرٹن نے جواب دیا کہ "حکومت بالادست اسکی مخالف نہیں ہے دیسی ریاستیں اسکی مجاز ہیں کہ ذمہ دارانہ حکومت عطا کریں۔ اس خصوص میں حکومت بالادست سے مشورہ بھی حاصل کر سکتی ہیں۔"

اس جواب سے کانگریس کو اچھا موقع ملا کہ اپنی غرض کی تکمیل کی ممکنہ کوشش کرے اور ریاستوں میں ہیجان پیدا کرے۔ چنانچہ کانگریس نے ہری پور میں یہ مسودہ منظور کیا کہ "کانگرس دیسی ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام اور حقوق کی حامی ہے جسکا ریاستوں میں فقدان ہے اسلئے کانگرس یہ اپنا فریضہ سمجھتی ہے کہ اسکے لئے سعی کرے لیکن موجودہ حالات ہمارے لئے نامساعد ہیں کچھہ تو اسلئے کہ والیان ریاست نے پابندیاں عائد کی ہیں یا یہ کہ برطانوی حکومت انکے توسط سے ہماری جد وجہد میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے دیسی ریاستوں کی رعایا میں خود اعتمادی پیدا کی جائے اور وہ بیرونی امداد یا

کانگریس کے نام و وقار پر منحصر نہ رہیں۔ کانگریس ایسی تحریک کا خیر مقدم کرتی ہے لیکن بہ حالت موجودہ اس تحریک کا بار ریاستی باشندوں پر بھی رہنا چاہیئے ایسی تحریکات پُرامن، غیر تشددانہ ہوں۔ انکے ساتھ کانگریس کی صرف اخلاقی ہمدردی وامداد ہوگی کانگریسی اراکین انفرادی طور پر اس سے زائد امداد دے سکتے ہیں۔ لہذا ریاستوں میں کانگریس کمیٹیاں قائم نہ کی جائیں اور اندرونی تحریکات اور جدوجہد کانگریس کے نام سے نہ کیجائے بلکہ اس کے لئے خود مختار انجمنیں قائم کی جائیں یا جو موجود ہیں انھیں جاری رکھا جائے۔ اسطرح کانگریس نے اعلان کیا کہ ریاستی معاملات میں اسکی پالیسی "عدم مداخلت" کی رہے گی لیکن اس نے حریت اور انسانی ہمدردی کے نام سے مختلف ریاستوں کے داخلی اُمور میں مداخلت کی۔ مسٹر بوس نے یہ صاف طور پر کہا کہ "باوجود" عدم مداخلت "کی پالیسی کے کانگریس مجبور ہو گی کہ دیسی ریاستوں کی رعایار کا ساتھ دے اور ان کے معاملات میں دلچسپی لے۔ ریاستی باشندے جسقدر زیادہ جدوجہد کریں گے اسی قدر زیادہ امداد انھیں کانگریس سے ملیگی"۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے بڑودا میں بہ دوران تقریر یہ کہا کہ "جب تک ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت قائم نہ ہو وفاق کے متعلق بحث کرنا عبث ہے"۔

اس کانگریسی مسودہ اور بیانات سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ہندوستانی قومی کانگریس کو دیسی ریاستوں کے باشندگان سے حقیقی معنی میں ہمدردی ہے بلکہ اس سے اسکی غرض وغایت کچھ اور ہے اسمیں اسکی خود غرضی پنہاں ہے کانگریس چاہتی ہے کہ ریاستی باشندگان اپنے نمایندوں کو ذریعہ انتخاب منتخب کرے گی

(ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو) تو مرکزی حکومت میں انھیں ہموار کرلے کہ اپنی اکثریت قائم کرلیگی۔ بہ خلاف اسکے اگر ریاستی نمائندے نامزد شدہ ہوں تو وہ والیان ریاست کی مرضی کے مطابق عمل کرینگے اور وہ کانگریس کے اثر میں بہ مشکل آسکتے ہیں۔ اس سے کانگریس کا مقصد کہ مرکزی حکومت میں اسکی اکثریت ہو پورا نہ ہوگا۔ نظام نے اس نے "عدم مداخلت" کی پالیسی کا اعلان کیا تاکہ وہ والیان ریاست کی ہمدردی بھی حاصل کرلے۔ لیکن اس کا عمل اس کے برعکس رہا ہے۔ وہ ترقی یافتہ ریاستوں کے نظم و نسق پر "نکتہ چینی" بدامنی اور خلاف قانون تحریکات کی جد و جہد کی حمایت کرتی رہی ہے۔ موجودہ کانگریس کا مقصد حصول آزادئ کامل نہیں بلکہ مستعمراتی درجہ ہے۔ وہ دل سے وفاق میں شریک ہونا چاہتی ہے لیکن ایسے ترمیمات کی خواہشمند ہے جن سے والیان ریاست کا موقف متاثر ہو اور مرکز میں اپنا اثر قائم رہے۔ غرضکہ شرکت وفاق میں نہایت حزم و احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ ہر سہ فریق اپنی غرض کی تکمیل کیلئے کوشاں ہیں (۱) کانگریس چاہتی ہے کہ خود مختار ہو۔ دیگر تمام سیاسی جماعتیں اور اقلیتیں اسکے زیر اثر رہیں (۲)۔ حکومت برطانیہ کی کوشش ہے کہ اسکا اقتدار باقی رہے اور ہندوستان ہاتھ سے نہ نکلجائے (۳)۔ دیسی ریاستیں چاہتی ہیں کہ ان کے اقتدار میں کمی نہ ہو۔ ریاستی داخلی امور میں کسی اور طاقت کی مداخلت نہ ہو۔ نفاذ وفاق کے بعد ان میں سے کسی دو کا متحد ہونا ضروری ہے۔ اگر حکومت اور کانگریس متحد ہوجائیں تو دیسی ریاستوں کو نقصان پہنچے گا مگر ہندوستان کی کامل آزادی کیلئے یہ مفید نہ ہوگا۔ حکومت نہیں چاہتی کہ والیان ریاست کی آزادی سلب ہو۔ حکومت دیسی ریاستوں کو

قائم رکھنا چاہتی ہے۔ حکومت اور دیسی ریاستیں ایک ہو جائیں تو یہ اتحاد بھی کانگریس کیلئے غیر مفید ہوگا، کانگریس کمزور ہو جائیگی مگر برطانوی حکومت کے مفاد اس سے بدرجہ اتم پورے ہونگے۔ حکومت کی کوشش ہے کہ یہ اتحاد عمل میں آئے لیکن کانگریس اسکی مخالف ہے۔ اگر کانگریس اور دیسی ریاستیں ملجائیں تو حکومت کمزور ہوگی۔ کانگریس کی کوشش بھی اسی قسم کے اتحاد کی ہے لیکن وہ والیان ریاست کی مرضی کے خلاف ریاستوں میں تحریکات آغاز یا انکی حمایت کرکے ہر دلعزیزی کھو رہی ہے ورنہ ممکن تھا کہ اکثر ریاستیں کانگریس کا ساتھ مرکزی حکومت کے امور میں دیتیں۔ جملہ حالات اور واقعات پر غور کرنیکے بعد یہ رائے مناسب اور صائب معلوم ہوتی ہے کہ کانگریس کی موجودہ روش کے مدنظر ریاستیں حکومت کا ساتھ دیں نہ کہ کانگریس کا۔ فی الوقت اسی اتحاد میں فلاح نظر آتی ہے۔ کانگریس نے اپنے اصلی مسلک کو بھلا دیا ہے۔ اس کو اپنے مسودات کا پاس نہیں ہے کانگریس اعلیٰ کمان معمولی صوبہ واری اختیار پر ہی جامہ سے باہر ہو کر دوسری اہم سیاسی جماعتوں اور اقلیتوں کے حقوق کو نظر انداز کر رہی ہے۔ دیسی ریاستوں کے باشندوں سے اسکو ہمدردی اسوقت ہو رہی ہے۔ اس کا یہ عمل محض سراب ہے۔ اس کو ہمدردی نہیں بلکہ اپنی غرض کی تکمیل کرنا مقصود ہے تا مرکزی حکومت میں اسی کی اکثریت رہے۔ اسکی عام پالیسی کا بہ نظر تعمق مطالعہ کیا جائے تو صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھارت ماتا کی آزادی کی خواہاں نہیں ہے بلکہ برطانوی راج کے زیر سایہ ہندو راج قائم کرنا چاہتی ہے۔ اسکی یہ ذہنیت اور پالسی نہ صرف اقلیتوں کے لیئے بلکہ بعض دیسی ریاستوں کیلیے بھی خطرناک ہے اسی لیئے اسکی مدافعت ابھی سے کرنی چاہیئے۔

اچھوت اقوام اور آزادی

امیر و غریب، کبیر و صغیر، حاکم و محکوم، آزاد و غلام وغیرہ یہ ایسے تصورات ہیں جو ہر ملک و قوم میں مروج اور یہ سوسائٹی کے تعلقات کے مظہر ہیں لیکن انسانیت کی سب سے نرالی تفریق جو کسی اور قوم و ملک میں پائی نہیں جاتی وہ "چھوت اور اچھوت" کی ہے اور یہ صرف ہندوستان میں مروج اور مستعمل ہے۔ اس تفریق و تقسیم کا انحصار مسئلہ "کرم" پر ہے جو شاستری مسئلہ ہے اس کا لب لباب یہ ہے "انسان اپنے سابقہ اعمال کے لحاظ سے جنم لیا کرتا ہے۔ اگر کوئی پست قوم میں پیدا ہوتا ہے تو وہ محض اپنے سابقہ اعمال کی بنا پر اور وہ اسی حالت میں فوت ہوگا۔ وہ نیک اعمال سے انسانیت کا بہتر مرتبہ اپنی حیات میں حاصل ہی نہیں کر سکتا"

اسی انوکھے تخیل کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی سات کروڑ پست اقوام کی آبادی کو انسانیت کا بنیادی حق بھی عطا نہیں کیا گیا۔ انھیں چھوت، ملیچھ وغیرہ حقارت آمیز الفاظ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان میں یہ احساس نہیں پیدا کروایا جاتا کہ وہ بھی انسان اور اشرف مخلوق ہیں اور اکتساب سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ انکے ساتھ انسانیت سوز برتاؤ کیا جانا اظہر من الشمس ہے۔ ہر ہندوستانی اس سے ناواقف نہیں ہے کہ پست اقوام کی آبادی بستی سے باہر رہتی ہے۔ انکے کنوئیں علحدہ ہوتے ہیں۔ اگر کہیں انکے لئے میٹھے پانی کی باؤلی نہ ہو تو اعلیٰ ذات والوں سے منت کرنے پر کوئی اوپر سے پانی ڈالتا ہے جس کیلئے انھیں گھنٹوں انتظار

کرنا پڑتا ہے۔ انکے بچے مدرسہ میں شریک نہیں ہو سکتے یعنی انکے لئے تعلیم کا دروازہ بند ہے۔ سرکاری کاغذات پر انکے نشان ابہام لینا ہو تو پتھر پر روشنی ڈالدیجاکر کاغذ دور رکھا جاتا ہے اسکے بعد وہ اپنا نشان ثبت کرتا ہے۔ منادر میں انکا داخلہ ممنوع ہے۔ انکا سایہ بھی کسی اعلیٰ ذات والے پر نہیں پڑنا چاہئے اور نہ انھیں چھونا چاہئے۔ کوئی پست قوم کا شخص حاکم ہو تو اسکے ماتحتین ایک خاص لباس دفتری اوقات کیلئے تیار کروالیتے ہیں۔ گھر پہنچنے کے بعد اسکو علٰحدہ رکھکر بعد حمام دوسرا لباس پہن لیتے ہیں۔ ہوٹلوں میں انکے لئے جگہ مختص کردی جاتی ہے۔ انکی پیالیاں اور ظروف علٰحدہ رکھے جاتے ہیں۔ وہ چیز خریدیں تو اوپر سے دی یا ڈالی جاتی ہے۔ ذلیل ترین پیشے ان کیلئے مخصوص کردئے گئے ہیں۔ ان میں یہ خیال ذہن نشین کروایا گیا ہے کہ وہ پیدا ہی اسلئے ہوئے ہیں کہ دوسروں کے آرام و آسایش کیلئے ذلیل خدمات ہی انجام دیں۔ غرضکہ انکے ساتھ جو ناروا سلوک کیا جاتا ہے اسکی تفصیل امریکن خاتون مس میو کی کتاب "مادر ہند" میں درج ہے (ملاحظہ ہو صفحات ۱۲۲ و ۱۲۳) پست اقوام کے مشہور لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر نے بھی اپنے تلخ تجربات کا بارہا ذکر کیا ہے۔

یہ تفصیلات اور واقعات زمانۂ جاہلیت کے نہیں بلکہ بیسویں صدی عیسوی کے ہیں جبکہ ہر شخص مہذب، شائستہ اور روشن خیال ہونے کا مدعی ہے۔ صدہا سال سے اس امتیاز کو رفع کرنیکی مساعی کے باوجود یہ اب بھی جاری ہے۔ معیار انسانیت سے گرا ہوا سلوک جائز قرار دیا جاتا ہے۔ موجودہ اور پچھلے زمانہ میں فرق صرف اسقدر ہے کہ اب پہلے کی طرح "مذہبی تعلیم کی آواز کسی پست قوم شخص کے

کان میں پڑتی تو کان میں سیسہ گرم کر کے ڈال دیا جاتا اگر وہ زبان سے مذہبی الفاظ ادا کرتا تو زبان کاٹ دی جاتی "یہ نہیں ہے ان ہی حالات اور واقعات کو ملاحظہ کرنیکے بعد اس خصوص میں ہندوستان کے پہلے پیشوا اور قوم لنگایت کے مصلح "بسویشو" نے تقریباً آٹھ سو سال قبل صدائے احتجاج بلند کی، ناجائز اور خلاف اخلاق برتاؤ کی مذمت کی اور اس کے خلاف تعلیم و تلقین شروع کی انھوں نے اسپر زور دیا ہے کہ "انسانیت کا معیار اسکے اعمال ہیں۔ ایک شخص اپنے اعمال صالحہ سے اسی جنم میں اعلیٰ اور پوتر ہو سکتا ہے نہ کہ پیدائش سے ہی کوئی درجہ اپنے ساتھ لاتا اور اسی حالت میں فوت ہوتا ہے۔ پست قوم کا ایک نیک شخص ایک بد اخلاق اعلیٰ ذات والے پر قابل ترجیح ہے۔" غرضکہ آپکے خیالات نہایت پاکیزہ اور تعلیم اس زمانہ کیلئے نعمت غیر مترقبہ تھی (اور اب بھی ہے) خدا کے پیغام کو آپ نے ہر شخص تک پہنچانے کی کوشش کی اور آپ کے حلقہ مریدین میں چمار وغیرہ بھی تھے جو مذہبی تعلیم پاتے اور عمل کیا کرتے تھے۔

آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل ہادیٔ اسلام نے یہی تعلیم دی اور خدا کے پیغام کو ہر شخص تک پہنچایا اور یہ انسانیت پر احسان عظیم ہے۔ آپکی یہ تعلیم رہی کہ "ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے وہ امتیازات سے پاک ہوتا ہے۔ اعمال کے لحاظ سے انسان کے مدارج ہوا کرتے ہیں۔ نہ وہ پیدائش سے ہی گنہگار ہوتا ہے نہ اسکے لئے کسی اور نے مصائب برداشت کئے تھے اس لئے وہ مواخذہ سے بری ہے۔ انسان آپسمیں مساوی ہیں کسی کو کسی پر برتری

حاصل ہو نہیں سکتی ہے اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف اسکے اعمال سے"۔

انیسویں صدی میں ہندوستان میں چند مصلحین پیدا ہوئے مثلاً سوامی دیانند، سوامی دوسکانند ہیں چندر پال وغیرہ جنھوں نے قوم سے اپیل کی کہ وہ انسانیت سوز برتاؤ کو مٹا دیں، پست اقوام کو انسانی درجہ عطا کریں۔ حیوانوں کو چھوا اور اپنے قریب رکھا جاتا ہے مگر اپنے سے انسان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا اور برا برتاؤ کرنا مذہبی احکام کے خلاف اور اصول سوسائٹی کے مغائر ہے۔ یہ صدا بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اسی بدسلوکی کا نتیجہ ہے کہ ہندوؤں کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ اعلیٰ ذات والوں کے برتاؤ سے تنگ آکر یا تو عیسائیت قبول کر رہے ہیں یا آغوش اسلام میں آرہے ہیں۔ عیسائی ادارے، پست اقوام کی حالت درست کرنے میں کافی جد و جہد اور ممکنہ امداد کرتے رہے ہیں۔ صحیح معنی میں وہ بھی مساوات عطا کرنے اور ایسا یکجہتی پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے پاس امتیاز رنگ و نسل ہے۔ رنگ کے لحاظ سے اُنکی عبادت گاہیں قائم ہیں۔ سفید اقوام خود کو اعلیٰ سمجھتی ہیں اور سیاہ فام قوموں کو بنظر حقارت دیکھتی ہیں انھیں معلوم کر لینا اور تائب ہونا چاہیئے کہ ان کے پیغمبر و ہادی ایشیائی اور سیاہ فام قوم سے ہی تھے۔ ایسی تعلیم اور برتاؤ سے پست اقوام کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ یہ طرۂ امتیاز صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے امتیاز رنگ و نسل کو مٹایا۔ غلامی کو ناپید کیا۔ غلاموں کو بادشاہت سے سرفراز کیا جس کی زندہ مثال خود ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک ہے۔

غرضکہ ان دو تبلیغی مذاہب عیسائیت و اسلام کی تعلیم اور کشش دیکھکر ہندوستان میں بھی ایک ایسا طبقہ نکلا جو ہندو مذہب کو اگرچہ وہ تبلیغی نہیں ہے اور نہ اصولاً ہو سکتا ہے، تبلیغی مذہب بنایا گیا اور عیسائیت و اسلام کے مقابلہ میں اپنی تبلیغ شروع کر دی' یہ ادارے آریہ سماج' برہمو سماج کے نام سے موسوم ہیں انکا تبلیغی انحصار بیشتر اپنے محاسن بیان کرنے پر نہیں بلکہ دوسروں کے عیوب کو جو دراصل عیوب نہیں ہیں' ظاہر کرنے پر ہے۔ ایسا عمل انکے احکام کے لحاظ سے بھی جائز نہیں ہے مگر اسکی پابندی نہیں کی جاتی۔ اسی لئے آپسمیں آئے دن مناقشات ہوا کرتے ہیں۔ مذہب جو کہ صلح و امن کا مصدر سمجھا جاتا ہے بد امنی و انتشار کا سرچشمہ بنایا گیا ہے۔ کثرت مذاہب کی وجہ سے ہندوستان میں اسکی کماحقہٗ قدر نہیں ہو رہی ہے۔ مذاہب کی صحیح معنی میں غرض و غایت سمجھیں تو یہ اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ مشکل یہ ہے کہ اب تبلیغ کو سیاسی آلہ کار بنایا گیا ہے۔

سیاسی پہلو کو پیش نظر رکھکر گاندھی جی نے پست اقوام کو ابھارنے اور انکی حالت درست کرنیکے لئے تحریک "ہریجن اُدھار" آغاز کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ پست اقوام جن کی تعداد سات کروڑ ہے وہ عام ہنود سے علیحدہ تصور نہ کئے جائیں اور ان کا سیاست میں علیحدہ مقام نہ ہو بلکہ ان میں ضم ہو جائیں۔ اسی مسئلہ پر انھوں نے اپنی جان کی بازی لگانے کا اظہار دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر کیا اور ہندوستان آنیکے بعد دوسری مرتبہ پونہ میں (۲۱) یوم کا برت رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپسمیں صلح ہوئی اور سنہ ۱۹۳۵ء میں عام ہنود اور ہریجن یا پست اقوام میں میثاق پونہ تکمیل پایا جس کی رو سے

فرقہ وارانہ فیصلہ میں تبدیلی ہوئی۔ فرقہ وارانہ فیصلہ کی رو سے پست اقوام کے لئے جو نشستیں محفوظ و علیحدہ کر دی گئی تھیں وہ باقی نہ رہیں اور وہ عام ہندو میں ضم ہوئے۔ جدید دستور ہند کے تحت کانگریسی وزارتیں قائم ہونے کے باوجود تجربہ شاہد ہے کہ پست اقوام کی دوہری غلامی یعنی سیاسی و سماجی بدستور باقی ہے۔ میثاق پونہ سے پہلے گاندھی جی نے اس امر کا انھیں اطمینان دلایا تھا کہ تالیف قلوب کے ثبوت میں مناد پست اقوام کے لئے کھول دئے جائیں گے حتیٰ کہ اسکے لئے قانون داخلہ مناد بھی نافذ کیا جائے گا۔ ۱۹۳۸ء میں پست اقوام کے لیڈر مسٹر ایم۔ سی۔ راجہ نے مدراس اسمبلی میں مسودہ داخلہ مناد پیش کیا جسکو مدراس کے وزیراعظم مسٹر سی راجگوپال چاری نے مرتب اور گاندھی جی نے پسند کیا تھا۔ اسمبلی میں چند ماہ بعد جب اس مسودہ پر بحث کی نوبت آئی تو مرتب کنندہ مسٹر راجگوپالا چاری نے کہا کہ اس مسودہ کو واپس لے لو۔ اس پر مسٹر راجہ سخت متعجب و نادم ہوئے۔ صرف ضلع ملابار کی حد تک اس کو نافذ کیا گیا۔ مسٹر راجہ کا بیان ہے کہ میثاق پونہ سے پست اقوام کو چند نشستیں زائد ملیں لیکن عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کانگریس پست اقوام کے اصلاح کی تحریک کی حامی ہے گاندھی جی کانگریس کے آمر اور اس تحریک کے بانی ہیں باوجود اسکے آٹھ کانگریسی وزارتوں میں کسی صوبہ میں پست قوم کے لیڈر کو وزارت نہیں دیگئی حالانکہ ان میں بھی قابل افراد موجود ہیں۔ ڈاکٹر کھرے سابق وزیراعظم صوبہ متوسط اپنی وزارت میں ایک پست قوم کے لیڈر کو —— رکھنا چاہتے تھے مگر گاندھی جی نے اسکو ناپسند کیا۔ کہا جاتا ہے کہ منجملہ اور اسباب کے اس وجہ سے بھی وہ معتوب ہوئے۔

حال میں پست اقوام کے لیڈر ڈاکٹر امبیڈ کر نے مسئلہ راج کوٹ اور پست اقوام کی نمائندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گاندھی جی کے بیان سے وہ غیر مطمئن ہیں اور میثاق پونہ سے کوئی فائدہ اپنی قوم کو نہیں پہونچا مختصر یہ کہ پست اقوام کی ہزار ہا سال کی غلامی بدستور باقی ہے انکے ساتھ جو سلوک پہلے تھا وہ اب بھی جاری ہے۔ نفرت و حقارت محبت و عزت سے نہیں بدلی۔ یہ تحریکات سراب ہیں خوش کن الفاظ اور تصورات سے ہی ان جاہل اور بے زبان اشخاص کو خوش رکھکر ان کی تعداد سے ناجائز فائدہ حاصل کرنیکی کوشش کی جارہی ہے۔ بنی الواقعی ہمدردی ہے تو انھیں انسانیت کا درجہ عطا کر کے مساویانہ سلوک کرنے میں کوئی امر مانع ہے۔ جبکہ خود ایک ہی ملک کے باشندوں میں یہ عمل جاری ہے کہ بعض کے ساتھ انسانی برتاؤ نہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے تو غالب قوم سے کس طرح آزادی کا مطالبہ کیا اور اسکے تکمیل پانے کی توقع کی جاسکتی ہے اسی بے جا فرق مراتب کا نتیجہ ہے کہ بھارت ماتا کی آزادی ایشور کو بھی منظور نہیں اسی لئے روز بروز آپس کے اختلافات بڑھتے ہی جارہے ہیں جس کی وجہ سے باہر کی قوم کو بہتر میدان ہاتھ آرہا ہے اور اس کے قدم مضبوط ہوتے جارہے ہیں۔ مس میو کی کتاب "مادر ہند" پر لعن طعن کیا گیا اور مختلف کتب اس کے جواب میں لکھے بھی گئے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے اکثر بیانات حقائق پر مبنی تھے کہیں کہیں مبالغہ سے کام لیا ہے اس نے ہندوستانیوں کے عیوب کو جو ہمیں عیوب نہیں معلوم ہوتے یا انکا احساس نہیں ہے۔ ظاہر کیا ہے۔ اس کے جواب میں امریکن اور یوروپین اقوام کے عیوب ظاہر کئے گئے ہیں۔ یہ طریقہ

کمزور استدلال کا ہے نقائص کا جواب محاسن سے دیا جاتا اور اس کے لئے دلائل ہوتے تو وہ معقول استدلال ہوتا اسکے پاس اپنے نقائص کا جواب صرف ایک ہے اور وہ "آزادی" ہے یہاں "غلامی"۔ مغربی ممالک کی سیاحت کرنیوالوں کے تجربات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی ممالک میں ہندوستانیوں کے ساتھ بعض جگہ ایسا ہی برتاؤ کیا جاتا ہے جیسے (دو جنمی ہندو) پست اقوام کے ساتھ کیا کرتے ہیں گویا انکی نظر میں) ہر ہندوستانی "اچھوت" ہے۔ لندن میں کہیں مکان کرایہ پر دئے جانیکی تختی ٹنگی ہو اور کوئی ہندوستانی کرایہ پر رہنا چاہے تو اکثر انکار کردیا جاتا ہے کسی ہوٹل میں ایسی ٹیبل پر جہاں پہلے سے کوئی یوروپین بیٹھا ہو وہاں ہندوستانی جا بیٹھے تو وہ وہاں سے اٹھ جاتا ہے اور وہاں بیٹھنا اپنی ذلت سمجھتا ہے بعض ہوٹلوں اور کلب میں داخلہ ممنوع ہے۔ بعض مرتبہ ہوٹل کے مالک سے کہا جاتا ہے کہ کوئی ہندوستانی وہاں ہو تو اسکو نکال دیا جائے۔ کیا یہ تجربات اور ناقابل تردید واقعات کافی نہیں ہیں کہ کسی کے احساس خودداری کو ٹھیس لگائے۔ باہر یہ سوال نہیں کیا جاتا کہ ہندو ہے اور ہے تو دو جنمی یا ایک جنمی مسلمان ہے یا سکھ یا پارسی یا کرسچین بلکہ قومیت دیکھی جاتی ہے اور اسی لحاظ سے ذلت آمیز برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ظاہرا طور پر یوروپین اقوام کی سی زندگی بسر کرتے ہوئے یہ سمجھنا کہ خود کو بھی آزادی حاصل ہے محض دھوکہ ہے افسوس اس کا ہے کہ ہندوستان کی اکثریت کے لیڈر باوجود ان امور سے واقف رہنے کے حقیقی معنی میں حریت کے طالب نہیں ہیں۔ خود غرضی نے انھیں اندھا کر دیا ہے۔ اگر وہ وسعت قلبی سے کام لیں تو اب بھی اتحاد ہو سکتا ہے۔ اچھوت اقوام کی پستی رفع

اور بھارت ماتا کے ماتھے سے غلامی کا ٹیکہ مٹ سکتا ہے۔

"مُسلمانوں کی سیاسی بیداری"

ہندوستانی مسلمانوں کی بہت کم تعداد ایسی ہے جن کے آباو اجداد نے بیرونی ممالک سے آکر یہاں توطن اختیار کیا۔ بیشتر حصّہ آبادی ایسا ہے جس نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا۔ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اسکی اشاعت میں صوفیائے کرام نے زیادہ حصّہ لیا۔ مبلغین کی زیادہ کوشش نہیں رہی بلکہ یہاں کے باشندگان خود عقیدتاً حلقہ بگوش اسلام ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں تقریباً ایک ہزار سال مسلمانوں کی حکومت رہی۔ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کو یہ فوقیت رہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت سے قبل بھی دار السلطنتیں اسی سرزمین میں قائم رہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا اور یہیں کے ہو رہے۔ جس عدیم النظیر رواداری، وسعت قلبی اور بے تعصبی سے انھوں نے حکومت کی ہے وہ ان کے فرامین و خطوط سے بخوبی ظاہر ہے۔ مزید برآں یہ کہ باوجود طویل عرصہ تک حکومت و اقتدار رکھنے کے وہاں مسلمانوں کی اب بھی اکثریت نہیں ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی یہ کہے کہ ہندوستان میں اسلام جبر و تشدد سے پھیلا تو وہ تنگ نظری پر مبنی ہوگا۔

ہر قوم کے ساتھ عروج و زوال لگا ہوا ہے۔ اکثر زوال اندرونی اسباب کی بنا پر آتا ہے۔ آخری دور میں مغل بادشاہ زیادہ عیش پسند رہے۔ بجائے مردمیدان

بننے کے میر مشاعرہ ہونیکی زیادہ کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزیت کا اثر کم ہو چلا۔ برائے نام سلطنت وسیع تھی لیکن کوئی اقتدار باقی نہ تھا اسلئے طاقتور قوم کا شکار بننا پڑا۔ مغلیہ دور نے مختلف شعبہ جات زندگی پر مثلاً علوم و فنون، حسن کاری، فن تعمیر وغیرہ پر گہرا اثر ڈالا ہے لیکن جو انمٹ اور شاندار یادگار ان کے دور حکومت کی ہے وہ زبان "اردو" ہے۔ یہ ہندو مسلم تمدن کے امتزاج کا نتیجہ اور دونوں اقوام کا سرمایۂ مشترک ہے۔

یوں تو انگریزوں کا قبضہ و اقتدار ہندوستان پر بتدریج بڑھ رہا تھا مگر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے آئینی و مسلمہ طور پر انکا اقتدار قائم ہوا۔ آخری مغل بادشاہ نظر بند کئے گئے۔ کمپنی کے بجائے شاہ انگلستان نے ہندوستانی سیاسی اقتدار حاصل کیا اور انگریزی حکومت قائم ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس حکومت نے پورے ملک پر اپنا اثر جمایا بعض دیسی ریاستوں نے اسکی اطاعت تسلیم کرلی بعض نے سرپرستی قبول کی تو بعض نے مساویانہ دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔

اس دور کے ساتھ برطانوی سیاسی نظریے و تصورات ہندوستان میں ترویج پانے لگے۔ انگریزی تعلیم لازمی اور سرکاری زبان انگریزی قرار دی گئی۔ تعلیم ذریعہ ملازمت ہونیکا تخیل پیدا کیا گیا۔ اس تخیل پر عمل کرنیکا یہ نتیجہ ہوا کہ بعض انگریزوں نے ہندوستانیوں کو "قوم صیغہ داران" کا لقب دیا۔ ابتدائی دور میں برطانوی حکومت کی یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کے سر سے حکومت کا سودا نکل جائے۔ مختلف طریقوں سے انھیں پست ہمت کرنیکی سعی کی گئی۔ غیر مسلم سے سلوک اچھا رہا۔ انھیں مراعات عطا کئے گئے انکی تعلیمی و معاشی حالت بہتر

ہونے لگی۔ مسلمان کچھ تو اپنی پستی پر اظہار تاسف کر رہے تھے اور کچھ حکومت کی بے رخی پر خاموش تھے لیکن جب دیکھا کہ حالت ابتر ہوتی جارہی ہے اور مقابلتاً جہالت و مفلسی بڑھتی جارہی ہے تو مسلمانوں کے جمود کو توڑنے میں سرسید نے زیادہ حصہ لیا تعلیم کیطرف انھوں نے خاص توجہ فرمائی اور اپنے مشن میں کامیابی حاصل کی مسلمانوں سے حکومت عرصہ تک مشتبہ رہی بالآخر اس کو تسلیم کرنا پڑا کہ "یہ قوم کچلنے سے دبنے والی نہیں"۔ اس کے بعد اس کا سلوک اچھا رہا مسلمانوں کے دور قنوطیت میں غیر مسلم کی ہر شعبہ زندگی میں کافی ترقی رہی۔ انگریزی تعلیم حاصل کی ملازمت میں انکا زیادہ حصہ رہا۔ معاشی حالت بہتر ہوئی۔ مغربی تعلیم و سیاسی تصورات کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔ ہندو آزادیٔ ملک کے خواہاں ہوئے۔ حکومت کے خلاف سیاسی تحریکات شروع کردیں۔ مسلمانوں سے امتناع گاؤکشی اور ترویج زبان ہندی کی تحریکات آغاز کرکے مخالفت شروع کی۔ ان واقعات سے مسلمان بیدار ہوئے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں ہندوؤں کی مخالفت کا زیادہ حصہ رہا ہے۔ مسلمانوں نے سوچا کہ یہ وقت غفلت و انتشار کا نہیں بلکہ متحد ہوکر ان تحریکات کا مقابلہ کرنے کا ہے۔ حکومت ہندوؤں سے بدظن ہوئی اور وہ چاہتی تھی کہ مسلمانوں کیساتھ ہمدردی کرے۔ اسطرح وہ وفادار رہیں۔ مسلمانوں نے اس رجحان سے فائدہ اٹھایا۔ خلافِ حکومت تحریکات میں حصہ نہیں لیا اسلئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں وہ بہت پیچھے ہیں اور انھیں قوم کی تعمیر میں زیادہ کام کرنا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی دو انجمنیں یکے بعد دیگرے علی گڑھ میں "محمڈن ڈفنس لیگ" اور "پیاٹری یاٹک ایسوسی ایشن" قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں کی پالیسی کی

تشکیل میں انگریزوں کا ہی زیادہ حصہ رہا۔ یہ دونوں مسلمانوں کی سیاسی انجمنیں تھیں لیکن ان سے کوئی سیاسی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ انکی عنان دوسروں کے ہاتھ میں تھی اور مسلمانوں کو آزادیٔ خیال وعمل حاصل نہ تھی۔

۱۸۸۵ء میں ہندوستانی قومی کانگریس قائم ہوئی۔ عام طور پر مسلمانوں نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس زمانہ میں انکی شرکت قبل از وقت تھی۔ انہوں نے سیاسی میدان میں نہایت حزم واحتیاط سے قدم رکھا۔ مارلے منٹو اصلاحات سے قبل جو اصلاحات نافذ تھے ان سے مسلمانوں کو مستفید ہونیکا غیر مسلم نے کم موقع دیا تھا۔ اکثریت نے اپنی روایتی تنگ نظری کا ثبوت دیا تھا۔ اسلئے مسلمانوں نے متحد ہوکر حکومت کے سامنے مطالبات پیش کئے۔ یہ مسلمانوں کی پہلی منظم سیاسی جدوجہد تھی جس میں انکی تشفی بخش کامیابی رہی۔ حکومت نے انکے مطالبات کو بہت پسند کیا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں نے اپنی پہلی سیاسی متحدہ انجمن "مسلم لیگ" قائم کی جس کا پہلا اجلاس بہ مقام ڈھاکہ بہ صدارت نواب وقار الملک بہادر منعقد ہوا۔ آپ نے جس دوراندیشی اور دقیقہ رسی سے اس زمانہ کی سیاسی حالات کا تجزیہ فرماتے ہوئے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح موجودہ مکدر سیاسی فضاء کے مدنظر مسلمانوں کو آگاہ کر رہے ہیں۔ نواب وقار الملک بہادر مرحوم نے کانگریس میں شریک نہ ہونے پر زور دیا ہے۔ انھوں نے اسی وقت فرمایا۔۔۔ کہ "ہندو برطانوی حکومت کے زیر سایہ ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حقیقی آزادی کے خواہاں نہیں ہیں مسلمان

کانگریس میں شریک ہوں تو نقصان ہوگا" سر سید بھی "عدم شرکت" کے حامی تھے لیکن آپ کا خیال تھا کہ پہلے مسلمان اس قابل ہو جائیں۔ اس لئے کہ دونوں اقوام کا اسوقت ساتھ نہیں ہو سکتا۔ ایک قوم بہت پیچھے ہے۔ مارلے منٹو اصلاحات کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسکی رو سے جداگانہ طریق انتخاب جاری کیا گیا۔ اقلیتوں کے حقوق و مفاد کا خاص طور پر تحفظ کیا گیا۔

قائدین ملت کے انتباہ پر مسلمان کچھ عرصہ تک عمل کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا انضمام عمل میں آیا۔ میثاق لکھنؤ تکمیل پایا۔ جس میں مسلمانوں نے اپنی روایتی رواداری، بے تعصبی اور وسعت نظری کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ یہ میثاق تاریخ جمہوریت ہند میں اپنی آپ نظیر رکھتا ہے اسکی رو سے مسلمانوں نے اپنی اکثریت کو اقلیت میں بدل دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ اکثریت نے آجتک کبھی اپنی عالی حوصلگی کا ثبوت نہیں دیا۔ یہ اتحاد وارتباط ۱۹۲۰ء میں نصف النہار پر پہنچا۔ دونوں اقوام میں جو اتفاق اس زمانہ میں نظر آیا وہ فقید المثال ہے۔ کانگریس کی تحریک ترک موالات اور مسلمانوں کی تحریک خلافت دونوں ملا دی گئیں۔ ان تحریکات میں زیادہ حصہ گاندھی جی اور علی برادران کا رہا ہے۔ ان تحریکات سے عوام بھی دلچسپی لینے لگے ورنہ اس سے پہلے صرف تعلیم یافتہ حضرات ہی ان سے واقف اور کسی قدر دلچسپی لیا کرتے تھے۔ عوام میں بیداری پیدا ہوئی۔ اس زمانہ کے ہندو مسلم اتحاد سے ہندوستانیوں نے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔

تحریک خلافت سے پہلے مسلمانوں نے "خدام کعبہ" کی تحریک آغاز کی۔

اسلام کی عالمی برادری کے خیال سے یہ تحریکات قابل ستائش ضرور تھیں۔ لیکن ہندوستان کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کثیر تعداد میں مسلمان جیل بھیجے گئے۔ ملازمین سرکار و طلبار نے ملازمت و تعلیم ترک کردی۔ اس خصوص میں ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

حکومت نے مانٹ فورڈ اصلاحات عطائے کئے لیکن کوئی خاص رعایت مسلمانوں کے ساتھ نہیں کیگئی۔ حکومت کا خیال تھا کہ ان اصلاحات کی مخالفت عرصہ تک نہ ہوگی۔ مگر بہت جلد اسکے خلاف احتجاج شروع ہوا۔ ہندو مسلم اتحاد کے بعد دور انتشار شروع ہوا۔ دونوں اقوام میں پھوٹ ڈالی گئی۔ نتیجہ یہ کہ کئی سال تک شدید فرقہ وارانہ فسادات کا بازار گرم رہا۔ خلیج اختلاف و منافرت بڑہتی چلی جس کو پاٹنے کے لئے گاندھی جی نے برت بھی رکھا لیکن تشفی بخش نتیجہ نہ نکلا اسی زمانہ میں مہاسبھائی تحریکات شدھی، سنگھٹن اور آریہ سماجی تحریک علانیہ مسلمانوں کی مخالفت کرنے لگیں۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے، یہاں مسلمان نہیں رہ سکتے، یا تو انھیں اپنے میں ضم کرلیں، یا ہندوستان سے نکال دیں، یا سیاسی حیثیت سے نہایت کمتر درجہ پر رکھیں۔ ان تحریکات کے خلاف مسلمانوں نے بھی تلقین شروع کردی کہ مسلمان منظم ہو جائیں۔ انتشار کو مٹائیں اور متحد ہو جائیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے باوجود سنجیدہ لیڈر سیاسی مسلک میں متحد تھے، میثاق لکھنؤ باقی تھا البتہ اکثریت پر وہ اعتماد مسلمانوں کا نہ تھا جو ان فسادات سے پہلے تہا۔ بعض سمجھدار ہندو لیڈروں نے بھی مسلمانوں کی مخالفت میں

حصہ لینا شروع کیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن ہندوستانیوں کی سیاسی بیداری وصلاحیت کار کی جانچ کیلئے ہندوستان بھجوایا گیا۔ اس کمیشن کی ہندو مسلم نے مخالفت ضرور کی لیکن اس سے پہلے دونوں اقوام میں سیاسی لائحہ عمل میں سمجھوتہ نہ ہو سکا تھا۔ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے ہندوستانیوں سے کہا کہ اگر وہ مانٹ فورڈ اصلاحات سے ناراض ہیں تو خود کوئی حل ہندوستانی سیاسی مسائل کیلئے پیش کریں۔ کانگریس نے اسکو منظور کر لیا۔ نہرو کمیٹی ترتیب دی گئی۔ مسلمانوں نے اس میں حصہ لیا اور اپنے مطالبات پیش کئے۔ میثاق لکھنو باقی نہ رکھے جانیکے وجوہ پیش کئے گئے۔ کانگریس اقلیت کو مطمئن نہ کر سکی۔ مسلمانوں کے جائز مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ مسٹر جناح نے چودہ مطالبات پیش کئے تھے جن کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا نتیجہ یہ کہ نہرو رپورٹ کی مخالفت مسلمانوں نے کی سیکھ اور پست اقوام بھی اس حل سے ناراض تھے غرضکہ اسکی وجہ سے مسلمان، کانگریس کی ذہنیت سے بدظن ہوئے وہ خیال کرنے لگے کہ قوم پرستی کے روپ میں یہ فرقہ واریت کی تلقین کر رہی ہے اس واقعہ سے مسلمانوں کی اکثریت کانگریس سے علحدہ ہو گئی۔

سائمن کمیشن کا مقاطعہ مسلمانوں نے بھی کیا مگر گول میز کانفرنس میں انھوں نے شرکت کی۔ کانگریس نے اس سے مقاطعہ کیا اور سول نافرمانی شروع کر دی اس تحریک سول نافرمانی میں بھی مسلمانوں نے حصہ نہیں لیا۔ اس عرصہ میں ہندو مسلم اتحاد کی کوشش لیڈروں نے کی مگر کوئی تشفی بخش سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر مولانا محمد علی مرحوم و دیگر ہندو مسلم لیڈروں نے اقلیتوں کے مسئلہ کے حل کی بہت کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

دوسری گول میز کانفرنس میں وائسرائے ہند لارڈ ہیلی فیکس کی کوشش سے بعض کانگریسی اراکین نے گاندھی جی کی قیادت میں شرکت کی۔ انکی موجودگی سے بھی کوئی فارمولا حل نہ ہوا۔ گاندھی جی نے ایک حل پر رضامندی ظاہر کی اور وہ پنڈت مالویہ کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اس پر گاندھی جی نے بھی سکوت اختیار کیا۔ مہاسبھائی لیڈر کو ہم خیال یا انکی مخالفت نہ کر سکے بالآخر یہ مسئلہ وزیر اعظم انگلستان کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے فرقہ وارانہ فیصلہ صادر کیا یہی وہ فیصلہ ہے جس سے ہندوؤں کی ذہنیت صاف طور پر ظاہر ہوئی کہ وہ مسلمانوں سے کس قدر سیاسی طور پر تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ اسکی رو سے مسلمانوں کے جملہ جائز مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا تاہم بعض صوبوں میں انکی اکثریت تسلیم کی گئی اور جہاں وہ اقلیت میں تھے وہاں مثل دیگر اقلیت کے انکے حقوق بھی محفوظ کئے گئے یہ مہاسبھائی اور آریہ سماجی ذہنیت کے لیڈروں کو ناگوار گزرا۔ انھوں نے علانیہ اسکی مخالفت شروع کی۔ کانگریس پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اس فیصلہ کو مسترد کرلے مگر کانگریس نے اس کو مسترد کیا نہ منظور۔ اس پر مسٹر آنے اور مالویہ جیسے لیڈر نے کانگریس سے بظاہر علیحدگی اختیار کی اور اپنی پارٹی علیحدہ قائم کی ہے۔

جدید دستور ہند کے تحت مسلمانوں کو جو حقوق عطا کئے گئے ان سے فی الوقت مسلمان مطمئن ہیں۔ جدید قومی پروگرام کے تحت مسلمانوں کو کام کرنا ضروری تھا، نئے حالات و نئے حقوق عطا ہوئے تھے۔ مسٹر محمد علی جناح نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ مسلم لیگ کو مستحکم کرنے اور مسلمانوں کو ایک علم کے تحت جمع اور منظم

و متحد ہونیکی دعوت دی۔ آپ ہی نے مسلم لیگ کا احیار کیا۔ انکی آواز پر لبیک کہا گیا ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں اسکی شاخیں قائم ہوئیں، باضابطہ مسلم لیگ کی پالسی پر کام چلایا جارہا ہے۔ یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ مسلمانوں کی واحد نمایندہ سیاسی جماعت مسلم لیگ ہے۔

جدید دستور کے تحت کسی قدر تامل کے بعد کانگرس نے بھی عہدے قبول کئے۔ سات صوبوں میں اسکی اکثریت رہنے سے وزارتیں قائم کی گئیں، بنگال، پنجاب میں مشترک وزارتیں قائم ہیں صوبہ سرحد کو اصلاحات دلوانے اور سندھ کو صوبۂ بمبئی سے علحدہ کرواکر مسلمانوں کی اکثریت قائم کروانے میں مسلم لیگ ہی نے کوشش کی۔ مہا سبھائی خیال کے کانگرسی لیڈروں نے اسکی سختی سے مخالفت کی۔ باوجود اسکے وہاں کے لیڈر یا مسلمان مسلم لیگ کا ساتھ نہ دینا یہ وہاں کے مسلمانوں کی تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشی ہے۔

صوبہ واری خود اختیاری کے تحت کانگریسی وزارت کو چند حقوق عطا ہوئے تو وہ جامہ سے باہر ہوگئی اقلیتوں کے حقوق کو نظر انداز کرنا شروع کیا۔ بالخصوص مسلمانوں کے مفاد کے خلاف اس کا عمل روز بروز ترقی پر ہے۔ امتناع گاؤ کشی ترانۂ وندے ماترم کی ترویج وردھا اسکیم یا ودیہ مندر اسکیم، ملازمین سرکار کے حقوق کا عدم لحاظ وغیرہ انکی ایسی روشن اور متعدد مثالیں ہیں کہ ان صوبجات میں مسلمان غیر مطمئن اور بقول نواب وقار الملک بہادر مرحوم مسلمانوں کی زبان، معاشرت، تمدن مفاد خطرہ میں ہے۔ باوجود اس کھلم کھلا مخالفت کے مسلمانوں کا ایک مختصر طبقہ ایسا بھی ہے جو کانگرس کا ساتھ دیرہا ہے۔ اس میں قابل ذکر حضرت

جمعیتہ العلمار ہند سے ممکن ہے وہ اس دہوکہ میں ہوکہ کانگرس کا مسلک حصول آزادی ہے اور خود بھی اسکے خواہاں ہیں لیکن انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ کانگریس فی الوقت کامل آزادی کی خواہشمند نہیں ہے بلکہ وہ اتنا اقتدار چاہتی ہے کہ اس سے مسلمانوں کے اور بعض اقلیتوں کے حقوق کو پامال کردے اور سیاسی طور پر محکوم کرلے اس پر بھی اگر جمعیتہ العلمار صحیح سیاسی مسلک اختیار نہ کرلے تو وہ اپنا آپ نقصان اٹھائیگی۔ مسلمانوں کی اہم اکثریت مسلم لیگ کی حامی اور اس کے پروگرام پر عمل کررہی ہے اسکے تن مردہ میں حال میں جان پڑی ہے اس قلیل عرصہ میں اسکو اپنے قومی لائحہ عمل میں جو کامیابی ہوئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ مسلمانوں میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مخالفین سے انھوں نے نصیحت حاصل کی اور خواب خرگوش سے بیدار ہوئے۔ اگر یہی احساس قائم رہا تو کوئی عارضی اقتدار انھیں محکوم نہیں کرسکتا۔ اقلیت و اکثریت کا مسئلہ ایک دہوکہ ہے۔ تعداد نہیں بلکہ صفات قابل لحاظ ہوتے ہیں۔ وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جسمیں زندہ رہنے کے آثار و صلاحیت ہو۔ دوسروں کی بڑہتی ہوئی قوت سے خائف ہونیکی ضرورت نہیں بلکہ اپنی کمزوریوں سے اور ان کمزور اور نقائص کو رفع کرنیکی تدابیر اختیار کرنا شرط اولین ہے۔ اسلام نے رواداری پر زور دیا ہے اور مسلمانوں نے اسپر کماحقہ عمل بھی کیا اسی رواداری کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان چند در چند مشکلات میں مبتلا ہیں۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کی رواداری کو انکی کمزوری پر محمول کیا جارہا ہے۔ ہر اصول کا استعمال اور پابندی خاص حالات کے تحت ہونی چاہیے۔

اب بھی مسلمان اسپر آمادہ ہیں کہ اکثریت ان سے باعزت طریق پر تعاون کرے، آپس کی بے اعتمادی کو دور کرے اور ہندوستان کی آزادی کیلئے متحدہ طور پر کوشش کرے لیکن افسوس اس کا ہے کہ اکثریت اپنے چند چھلے اختیارات میں مست ہے اور اس کو ہندوستان کی آزادی مطلوب نہیں ہے۔

جدید دستور ہند کے تحت دیسی ریاستیں اور برطانوی ہند کے صوبے وفاق میں شریک ہوکر عظیم تر ہندوستان کے تخیل کی تکمیل کر رہے ہیں۔ دیسی ریاستوں کی رعایا پریشان ہے وہ نئے سیاسی تصورات واداروں سے ناواقف ہے۔ والیان ریاست کا خاص سیاسی موقف ہے۔ وہ مخوف ہیں کہ کہیں اسکی شرکت سے انکے اقتدار میں تخفیف نہ ہو۔ کانگریس ان نئے حالات سے بیجا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ مسلم لیگ عدم مداخلت کے مسلک پر قائم تھی لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ آریہ سماج ہندو مہاسبھا اور کانگریس تینوں متحدہ طور پر بعض اسلامی دیسی ریاستوں میں بیجا مداخلت کر رہے ہیں تو وہ اپنا مسلک بدلنے پر مجبور ہے۔ کانگریس نے کشمیر ریاست میں مسلمانوں کو حقوق دلوانے میں کوئی کوشش نہیں کی جہاں مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت ہے اور وہ اکثریت میں بھی ہیں۔ برطانوی ہند کے سیاسی خیالات سے باشندگان دیسی ریاست متاثر ہو رہے ہیں اور یہاں بھی فرقہ وارانہ ذہنیت کا مضر اثر پھیلتا چلا جارہا ہے جس کا الزام مسلم لیگ پر نہیں بلکہ کانگریس اور بعض ہندو تحریکات پر ہے۔ بعض ریاستوں کی پرامن فضا کو مکدر کرنیکی کوشش بیجا کی جارہی ہے۔ مذہبی آزادی، اصلاحات وغیرہ عذرات کے تحت برطانوی ہند کے ہندو بیجا مداخلت کر رہے ہیں حالانکہ خود کے گلہ سے

ابھی طوق غلامی نہیں اترا ۔ ریاستی مسلمان برطانوی ہند کے مسلمانوں کے تلخ تجربات سے آگاہ اور مخصوص لائحہ عمل پر کاربند نظر آرہے ہیں فقط

"اکثریت بمقابلہ اقلیت"

سیاسی نظام کی ترقی یافتہ شکل "عمومیت" ہے جس کا گذشتہ صدی یورپ میں خوب دور دورہ رہا۔ جہاں اسکے محاسن ہیں وہاں اسکے معائب بھی ضرور اور کافی ہیں ۔ موجودہ صدی میں عمومیت کو ناکامی ہوئی ۔ یورپ اس طرز حکومت سے بیزار نظر آرہا ہے ۔ انگریزوں نے بھی ہندوستان کے لئے یہی نظام سیاسی بہتر اور موزوں سمجھکر قائم کیا۔ بجز اسکے ان میں کوئی اور تخیل آ نہیں سکتا تھا اسلئے کہ وہ خود بھی جمہوریت پسند اور صدیوں کی کوشش سے انھوں نے اپنے ملک میں ایک بہتر نظام قائم بھی کرلیا ہے ۔ بعض انگریز سیاست داں اس امر پر اظہار تاسف کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجائے جمہوریت کی بنیاد قائم کرنیکے صرف مجلس مشاورت کی حد تک ہندوستانیوں کا عنصر امور مملکت میں رکھا جاتا تو بہتر ہوتا اور آج سیاسی کشمکش سے دوچار ہونیکی نوبت نہ آتی ۔ غرضکہ ہندوستان میں جمہوری طرز حکومت کی بنیاد ڈالی گئی ۔ اب اسپر ہم غور کریں گے کہ اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی یا ہوسکتی ہے ۔ جمہوریت سے مراد صرف "اکثریت کی حکومت" ہے تو ظاہر ہیکہ جرمنی میں یہودیوں کے ساتھ جو انسانیت سوز برتاؤ ہورہا ہے وہ درست ہے ۔ حتیٰ کہ صرف ۲، ماہ کی حکومت

میں کانگریسی وزارتوں نے اپنے صوبوں کی اقلیتوں پر جو ظلم کیا ہے وہ جائز ہو سکتا ہے۔ فی الحقیقت عمومیت کا مقصد "اکثریت کی حکومت" ہی نہیں بلکہ ملک کے مختلف عناصر کو ایک رشتہ میں جوڑنا ہے۔ مختلف جماعتوں کو صحت بخش ترقی کے امکانات اور سہولتیں بہم پہنچانا ہے نہ کہ اس میں رکاوٹ پیدا کرنا یا انھیں کچل دینا۔ عمومیت کی روح آزادی ہے اگر آزادی ہی مفقود ہو تو عمومیت کی حیثیت جسد بے روح کی سی ہوگی۔ تمام جماعتوں کا مقصد، بحیثیت مجموعی ملک کی فلاح و بہبود ہو اور اُن کے پیش نظر ملک کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ہونا چاہئے۔ بالخصوص اکثریت میں فراخدلی و عالی حوصلگی کے احساسات کارفرما رہنا چاہئے۔ یورپ کے بعض اُن ممالک میں جہاں آمریت کی حکومت ہے، مقتدر جماعت کسی اور جماعت کو اپنے مدمقابل دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ اسکو ختم کرنیکے لئے فوری سخت تدابیر اختیار کرتی ہے۔ اسی لئے ان ممالک میں شہریوں کو حقیقی معنی میں آزادی حاصل نہیں ہے فاسطیت اور نازیت اسی اصول کے حامی ہیں۔

ہندوستان میں اپریل ۱۹۳۷ء میں جدید قانون ہند ۱۹۳۵ء نافذ ہوا جسکی رو سے اصلاحات عطا کئے گئے۔ صوبہ واری خود اختیاری حاصل ہوئی۔ کانگریس کی سات صوبوں میں اکثریت رہی مگر اس نے دستوری احکام کے تحت وزارت تشکیل دینے سے انکار کیا۔ بالآخر گورنر جنرل اور گاندھی جی میں یہہ معاہدہ ہوا کہ گورنر اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال بلا وجہ موجہ نہ کریں اور وزارتوں کو اقلیتوں کے معاملات میں آزادی سے عمل کرنے دیں۔ اسی معاہدہ

اور اطمینان دلانے کا نتیجہ تھا کہ کانگریس کی جسارت بڑھ گئی اس نے "اصلاحات شکن" پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے وزارتیں قبول کیں مگر اُس کا ۲۷ ماہ کا عمل بتلاتا ہے کہ کسقدر دلچسپی سے اصلاحات کو بروئے عمل لایا اقلیتوں میں بالخصوص مسلمانوں کے حقوق کو اُس نے نہایت بے رحمانہ طریق پر تلف کیا۔ اسکی طویل مگر دلخراش داستان ہے جس کا ذکر اس سے قبل کے مضمون میں کر دیا گیا ہے۔ ہزاروں مثالیں ایسی ہیں جن سے کانگریس کی ظلم و زیادتی عیاں ہے۔ اسکے باوجود وزیر اعظم بنگال مسٹر فضل الحق کا چیلنج قبول کرنا جسارتِ بیجا ہے۔ کانگریسی وزارتوں نے اپنے اختیارات کا بدترین استعمال کیا۔ بالخصوص وزارت صوبہ متوسط۔ مگر کانگریس اعلیٰ کمان ہمیشہ اسکی تائید کرتی رہی اور حکومت نے چشم پوشی کی۔ غرضکہ کانگریسی وزارتوں نے خود کو حکومت کے نااہل ثابت کیا۔ ملک میں بجائے امن و آشتی کے بدامنی و بے اطمینانی کو فروغ دیا۔ بجائے اتحاد کے انتشار کو جگہ دی۔ اس امر کا ثبوت نہ صرف مسلم لیگ کے کھلے اعتراضات سے ملتا ہے بلکہ اس متحدہ بیان سے بھی جس کو سر سیتلواڈ، سر جہانگیر، مسٹر ساورکر، ڈاکٹر امبیڈکر وغیرہ لیڈروں نے بتاریخ ۲۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء شائع کیا۔ کیا ایسے ملک میں جہاں سیاسی پارٹیاں مذہب کی بنیاد اور نام پر قائم ہوں وہاں کوئی اکثریت اقلیت میں یا اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو سکتی ہے؟ اگر انکی بنیاد معاشی مفاد ہوتی (جیسا کہ یورپ میں ہے تو یہ ممکن تھا مگر ہندوستان میں جس صوبہ میں جس مذہب والوں کی اکثریت ہے وہی اکثریت میں رہیں گے اور ظاہر ہے، مقتدر جماعت بھی وہی ہو گی۔ جبکہ یہ امر مسلمہ ہے

کہ ہندو ملکی اکثریت چھ صوبوں میں ہے اور انکا عاقبتہ شرمناک عمل ہزارہا سال سے اچھوت اقوام سے اور فی الوقت دیگر اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں سے جیسا کچھ رہا ہے کیا ان سے توقع کیجا سکتی ہے کہ وہ حقیقی معنی میں عمومیت کے اصل اصول پر کاربند رہیں گے اور یہ کہ اقلیتوں کیساتھ انکا اشتراک عمل رہیگا و نیز اقلیتوں کی آزادی محفوظ و مصئون رہے گی۔

کانگریس نے برائے نام اپنا نصب العین "حصول کامل آزادی" بنا رکھا ہے۔ کامل آزادی کا رزولیوشن ۱۹۲۶ء میں منظور بھی کیا گیا تھا مگر اب وہ بغیر سابقہ رزولیوشن کو منسوخ کرنیکے "مستعمراتی درجہ" پر قانع رہنا چاہتی ہے۔ مستعمراتی درجہ حاصل ہو بھی جائے تو صرف داخلی امور مملکت میں کلیتہً آزادی حاصل ہوتی ہے۔ نہ کہ معاملات خارجہ میں۔ اس سے کانگریس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ہندو راج قائم کرلے، تمام اقلیتوں یا دوسری جماعتوں کو سر اٹھانیکا موقع نہ دے۔ دراصل وہ عمومی ادارہ نہیں ہے بلکہ اسکا عمل فاسطیت اور نازیت کے مماثل ہے۔ ایسا عمل رکھتے ہوئے حکومت سے اس امر کا مطالبہ کرنا کہ وہ مقصد جنگ یہ ظاہر کرے کہ "تحفظ عمومیت" ہے کس حد تک صحیح ہوسکتا ہے۔ پہلے خود عامل ہونا چاہئے۔ اسکی اسی خطرناک پالیسی کے مسٹر نریمان، ڈاکٹر کھارے، اور سوباش چندر بوس شکار ہوئے۔ اب وہ علانیہ کانگریس کی اس پالیسی کی مذمت کر رہے ہیں۔ اسی لئے اسمیں روز بروز کمزوری پیدا ہوتی جارہی ہے۔ خود سرگرم کانگرسی اراکین و صدر کیساتھ اس کا یہ بیجا عمل ہے تو اقلیتیں کسطرح اسکی حکومت میں محفوظ رہ سکتی ہیں۔ حال میں صوبہ متوسط کی مجلس مقننہ میں مسودہ جنگ پیش ہوا۔ اجلاس برخاست ہوتے ہی مجلس مقننہ میں ہی "گاندھی جی کی جے" کے نعرے کانگریسیوں نے لگائے۔ کیا یہ حکومتی ادارہ ایسے فرقہ وارانہ نعرے لگانیکے لئے ہے؟ یہ کوئی مندر یا خانگی مقام تھا وہاں دوسری جماعت کے اراکین بھی موجود تھے مگر انکے احساسات کا کوئی لحاظ

نہ کیا گیا۔ اُردو مدارس میں گاندھی جی کی تصویر آویزاں کرنا اور مسلم طلباء سے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرنیکی خواہش کرنا کس حد تک جائز ہو سکتا ہے۔ جماعتِ خاکساران سے انکی مخالفت انتقامی ذہنیت کا پتہ دیتی ہے۔ ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن سے صاف طور پر ظاہر و ثابت ہوتا ہے کہ انکا مقصد برطانوی حکومت کے زیر سایہ ہندو راج قائم کرنا ہے۔

قوم پرست مسلمانوں کی حالت پر جسقدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ انہوں نے کانگریس کے صرف الفاظ پر دھوکہ کھایا ہے۔ اسکے عمل کو انہوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ قوم پرست سلمان آزادئ ہند کے متمنی ہیں اور اُن میں خلوص بھی ہے مگر افسوس اسکا ہے کہ جس جماعت کا وہ ساتھ دیرہے ہیں اسمیں خود اسکی تڑپ نہیں ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسکے دلمیں تو اپنا راج قائم کرنا اور دوسری جماعتوں سے انتقام لینا ہے۔ ایسی صورت میں خود قوم پرست مسلمانوں کو بھی اطمینان سے رہنے کا موقع ہرگز نصیب نہ ہوگا۔ اگر آزادئ ہند کی انکے دلمیں تڑپ ہے تو وہ اپنی ایک علیحدہ جماعت قائم کریں کانگریس سے نہ ملیں اسلئے کہ وہ حقیقی معنی میں قوم پرست نہیں بلکہ شدید فرقہ پرست ہے اسکی نیت فاسد اور اسکے اصول و عمل میں سخت تضاد ہے۔ اگر قوم پرست مسلم ایک علیحدہ مستقل جماعت قائم کریں تو انکو بخوشی تعاون حاصل ہو سکتا ہے۔

گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد، اچھوت اقوام کی شرکت اور ریاست راجکوٹ کے مسئلہ پر اپنی جان کی بازی لگائی۔ آخری مسئلہ کانگریس سے متعلق بھی نہ تھا صرف ہٹ دھرمی کی بناء پر مرن برت رکھا۔ وائسرائے نے اپنا دورہ ملتوی کیا اور کسی طرح سمجھوتہ کروا دیا۔ اب جبکہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ پیش ہے کیا اس سے بہتر اور موزوں کوئی اور موقع مرن برت کا ہو سکتا ہے؟ ساری عمر جس نے آزادئ ہند کیلئے جد و جہد کی ہے اس موقع کو کس لئے کھویا جا رہا ہے۔ واقعہ یہ ہیکہ گاندھی جی اپنی تاویلات، تعبیرات، مبہم مذہبی الفاظ اور چال سے دنیا کو بیوقوف بنانا چاہتے ہیں مگر ایسے حربے ہر

وقت کارگر ہو نہیں سکتے۔ جب سنہ ۱۹۲۶ء میں یروڈا جیل سے نکلنے کے بعد گاندھی جی نے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کو دستخط کر کے معرا چک دیتا ہوں وہ جو مطالبات چاہیں اُسمیں درج کریں۔ جب مسلمانوں نے اپنے مطالبات پیش کئے تو فرمایا کہ افسوس کانگریس کی مجلس عاملہ اُنہیں تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اپنا مقصد تکمیل پاتا ہوا نہیں دیکھتے ہیں تو مجلس عاملہ کی آڑ لیجاتی ہے۔ کیا موجودہ سیاسی حالات نہیں ہیں کہ کانگریس اقلیتوں کو بالخصوص مسلمانوں کو اپنے اعتماد میں لیتی اور زاغلول پاشاہ مرحوم کے نقش قدم پر چلتی؟ مصر میں جب اختیارات ملے تو زاغلول پاشا نے اقلیتوں سے فرمایا کہ تم اختیارات لینے کے بعد جو باقی رہ جائینگے وہ اکثریت لینے پر رضامند ہے۔ یہ ہے فراخدلی اور حکمرانی کا جوہر۔ تنگ نظری اور عصبیت رکھنے والی قوم کبھی حکومت کی اہل نہیں ہو سکتی۔ معمولی مسائل پر بھی کانگریسی وزارتیں مستعفی ہونیکی دہمکی دیتی رہیں۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے یہی خیال کیا کہ حسب سابق حکومت مجبور ہو کر انکا مطالبہ تسلیم کر لیگی مگر انکا یہ اندازہ غلط نکلا۔ "اصلاحات شکن" جسکی پالیسی ہو اسکو مستعفی ہونے پر جو بار خاطر گزرا وہ مخفی نہیں ہے۔ حکومت نے ہوشیاری یہ کی کہ کانگریس کے خلاف خیالات معلوم کرنے اور کانگریسی وزارتوں کا استعفا پیش ہونے پر خود یا متبادل وزارتوں کے ذریعہ حکومت کی مشنری چلانیکے امکانات اور رجحانات پر (۵۲) لیڈروں سے تبادلۂ خیال کیا اور حکومت اپنے نزدیک مطمئن ہوئی۔ اقلیت کے لیڈروں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ اب گاندھی جی حکومت اور اقلیتوں پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ان دونوں نے آپسمیں سازباز کر لی ہے اور اس پر وہ بہت برافروختہ اور ناراض ہیں۔ گاندھی جی سے یہ دریافت کرنیکی جسارت کیجاتی ہے کہ شرفاء کے معاہدہ کا مقصد کیا تھا؟ کیا وہ معاہدہ حکومت اور کانگریس (اکثریت) کے مابین اسلئے نہ تہا کہ اقلیتوں کے معاملات میں گورنر دخل نہ دیں؟ کیا اس سمجھوتہ اور طمانیت کی وجہ سے اقلیتوں پر مظالم ڈہانیکا سنہری موقعہ اکثریت کو حاصل نہ ہوا تہا؟ اس عمل سے

تنگ آکر صرف بنظر تحفظ حقوق اقلیتوں نے حکومت سے سمجھوتہ کرھی لیا تو کیا بُرا کیا؟ اس کی ذمہ دار تو خود کانگریس ہے اگر کانگریس فی الواقعی عمومیت کی حامی ہوتی اور ہندو راج کا شیریں خواب نہ دیکھتی تو آج کانگریس کا مطالبہ منوا لیتیں اقلیتیں پیش پیش رہتیں۔ اسکے باوجود اقلیتوں پر بالخصوص مسلم لیگ پر الزام عائد کرنا کہ وہ آزادی ہند کی مخالف ہے صحیح نہیں ہوسکتا۔ مسلم لیگ سے ۱۹۱۶ء و ۱۹۳۷ء میں بحیثیت واحد نمائندہ جماعت کانگریس سے گفتگو کی اور میثاق لکھنو ۱۹۱۶ء میں عمل میں آیا۔ اب جبکہ مسلم لیگ زیادہ منظم اور مستحکم ہے اسکی اس حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔ فاسطیت ذہنیت کے تحت اسکو کانگریس میں ضم ہونیکے لئے کہا جاتا ہے جس کیلئے مسلمانان ہند ہرگز تیار نہیں ہیں۔ آزادی ہند سب کو مطلوب و مرغوب ہے بشرطیکہ تمام اہم جماعتوں میں خلوص، اتحاد و اتفاق ہو۔ مسلمانوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے خلوص اور ایثار کا ثبوت دیا ہے۔ ہر جماعت کو اپنے دائرہ میں پھلنے پھولنے کا موقع دیا جانا چاہئے۔ ہر جماعت اپنی اپنی جگہ مضبوط و منظم ہوگی تو ملک بحیثیت مجموعی قوی ہوگا۔ ایک فریب دہ استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ پہلے آزادی حاصل کرلی جائے اسکے بعد حقوق کا تعین کیا جاسکتا ہے وہ جماعت جو معمولی اختیارات پر ہی اپنے جامہ سے باہر ہو کر دوسری جماعتوں کو نیست و نابود کرنیکی ناپاک سعی کرتی رہی اس سے کیا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ آئندہ اصول جمہوریت و حکمرانی کا احترام کرے گی جسکی فطرت اوصاف حکمرانی سے عاری ہو اس سے ایسی توقع کرنی عبث ہے۔ اقلیتیں آزادی ہند پیش نظر رکھتے ہوئے منظم و مستحکم ہو رہی ہیں اسلئے کہ آئندہ اکثریت اصول جمہوریت کی خلاف ورزی کرے تو اسکی موثر مقاومت کرسکیں۔ ۔

[م جھ ر ل]